دعوتِ اسلام

دعوتی اور تعارفی مضامین

مولانا وحید الدّین خاں

بسم الله الرحمن الرحيم

دعوتِ اسلام

دعوتی اور تعارفی مضامین

مولانا وحید الدّین خاں

باب پنجم :

آغازِ کلام

مسلمان ختمِ نبوت کے بعد مقامِ نبوت پر ہیں، مسلمانوں کو پیغمبر کی نیابت میں وہی کام انجام دینا ہے جو پیغمبر نے اپنی زندگی میں براہ راست انجام دیا۔

اللہ کی نصرت کے تمام وعدے عملِ دعوت کی انجام دہی پر موقوف ہیں۔ اسی میں ملّتِ اسلامیہ کی دنیا اور آخرت کی کامیابی کا راز پوشیدہ ہے حتیٰ کہ امتِ محمدی کا امتِ محمدی ہونا بھی اس پر موقوف ہے کہ وہ اس عملِ دعوت کو انجام دے۔

اس کام کی صحیح ادائیگی کے لیے ضروری ہے کہ مسلمانوں کے اندر دعوتی شعور بیدار کیا جائے انھیں بتایا جائے کہ مسلمان اور دیگر اقوام کے درمیان جو تعلق ہے وہ داعی اور مدعو کا تعلق ہے نہ کہ ایک قوم اور دوسری قوم کا۔

اس مسئلہ کے مختلف پہلو ہیں ان پہلوؤں کو زیر نظر کتاب میں حسب ذیل ابواب کے تحت واضح کیا گیا ہے ——— پیغامِ دعوت، عملِ دعوت، واقعاتِ دعوت، امکاناتِ دعوت، آدابِ دعوت۔

اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ یہ کتاب مسلمانوں میں جذبۂ دعوت پیدا کرنے کا ذریعہ بنے تاکہ ایک طرف مسلمان اپنی دعوتی ذمہ داری کو پورا کرکے اللہ کے نزدیک سبکدوش ہو سکے اور دوسری طرف اس عملِ دعوت کے نتیجہ میں اقوامِ عالم پر خدا کی رحمت کے وہ دروازے کھل جائیں جو موجودہ زمانہ میں ابھی تک بند پڑے ہوئے ہیں۔

وحید الدین خان

۳۱ اکتوبر ۱۹۹۶ء

باب اوّل :

پیغامِ دعوت

امت مسلمہ کا مقصد

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم دنیا میں اس لئے آئے کہ اللہ کے بندوں کو اللہ کی طرف بلائیں۔ آپ کے بعد یہی آپ کے پیروؤں کا مشن بھی ہے (قل ھذہ سبیلی ادعوا الی اللہ علی بصیرۃ انا ومن اتبعنی، یوسف ۱۰۸) قرآن سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ کی نظر میں سب سے زیادہ اہم معاملہ آخرت کا معاملہ ہے۔ وہ چاہتا ہے کہ موت سے پہلے آدمی اس حقیقت سے باخبر ہو جائے کہ اگر وہ اللہ والا بن کر نہیں مرا تو اس کے لئے خطرہ ہے کہ وہ ابدی بربادی کے جہنم میں دھکیل دیا جائے۔ موجودہ دنیا کے خاتمہ کے بعد جب اگلی دنیا بنائی جائے گی تو سارے لوگوں کا مقدمہ خدا کے یہاں پیش ہوگا۔ اس وقت لوگوں کے مستقل انجام کا فیصلہ کرنے کے لئے جو طریق عمل اختیار کیا جائے گا وہ یہ ہوگا کہ وہ داعیان حق وہاں گواہ بنا کر کھڑے کئے جائیں گے جنھوں نے دنیا کی زندگی میں ان قوموں تک اللہ کے دین کو پہنچایا تھا۔ پچھلے زمانوں کے لئے اس زمانہ کے انبیاء گواہ بنیں گے۔ بعد کے زمانے میں جب کہ نبوت ختم ہو چکی ہے، اللہ تعالیٰ نے یہ انتظام فرمایا ہے کہ نبی آخر الزماں صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی امت پر دین کی مکمل گواہی دے دی اور اس کے بعد اس امت کی یہ ذمہ داری قرار پائی کہ یہ قیامت تک دنیا کی قوموں کے اوپر داعی بن کر کھڑی ہوتی رہے تاکہ آخرت کے دن وہ قوموں کے مقدمے میں اللہ کی گواہ بن سکے۔ پیغمبر جس طرح ہمارے اور خدا کے درمیان واسطہ ہے اسی طرح یہ امت پیغمبر اور قوموں کے بیچ میں کھڑی ہوئی ہے اور پیغمبر کی طرف سے بالواسطہ طور پر تمام قوموں تک دعوت پہنچانے کے لئے مامور ہے:

وکذلک جعلنکم امۃ وسطا لتکونوا شھداء	اور اس طرح ہم نے بنا دیا تم کو بیچ کی امت تاکہ تم گواہ ہو
علی الناس ویکون الرسول علیکم شھیدا (بقرہ ۱۴۳)	لوگوں پر اور رسول ہو گواہ تمھارے اوپر

دوسری قوموں کے مستقبل کا انحصار اس پر ہے کہ وہ اللہ کے دین کو اپناتی ہیں یا نہیں۔ اسی طرح امت مسلمہ کا مستقبل تمام تر اس سوال پر معلق ہے کہ وہ اللہ کے دین کی گواہ بننے کے لئے اٹھتی ہے یا نہیں۔ جس طرح دوسری قوموں کی نجات کسی اور دین کو اختیار کر کے نہیں ہو سکتی، اسی طرح امت مسلمہ کی نجات کسی اور میدان میں عمل کر کے نہیں ہو سکتی، خواہ اس میں وہ کتنے ہی بڑے بڑے کارنامے دکھا رہی ہو۔ حتیٰ کہ صرف نماز روزہ بھی اس کی نجات کے لئے کافی نہیں ہے۔ حضرت یونس علیہ السلام کو جب مچھلی نے نگل لیا تو یہ "نماز روزہ" میں کوتاہی کی بنا پر نہ تھا۔ ان چیزوں میں آنجناب نے کبھی کوئی کمی نہیں کی تھی۔ ان کی کمی صرف یہ تھی کہ اپنی مدعو قوم پر دعوت کا حق ادا کرنے میں اجتہادی بنا پر ان کی طرف سے کوتاہی واقع ہو گئی۔ اتنی بات بھی اللہ کو پسند نہیں آئی۔ حقیقت یہ ہے کہ امت مسلمہ کی کامیابی، دنیا میں بھی اور آخرت میں بھی، تمام تر اس پر منحصر ہے کہ وہ دعوت الی اللہ کے لئے اٹھے اور اس کے تمام تقاضوں کے ساتھ اس کو انجام دے۔ بصورت دیگر اس کے لئے بربادی کے سوا اور کچھ نہیں۔ امت مسلمہ کے ساتھ اللہ کے تمام وعدے اسی قیمت پر ہیں۔ اگر وہ ایسا نہ کرے تو وہ اللہ کے یہاں بے قیمت ہو جائے گی، خواہ کسی اور میدان میں بزعم خود وہ کتنے ہی بڑے کارنامے انجام دے رہی ہو۔

امتِ وسَط

قرآن میں امت محمدی کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے کہ اور اس طرح ہم نے تم کو امت وسَط بنادیا تاکہ تم لوگوں کے اوپر گواہ بنو اور رسولؐ تمہارے اوپر گواہ ہو (البقرہ ۱۴۳)

وسَط کے معنی بیچ کے ہیں۔ یعنی وہ چیز جو دو چیزوں کے درمیان ہو (وسط الشیئ ما بین طرفیہ) مثلاً عربی میں کہا جاتا ہے کہ قبضتُ وسَطَ الحبْل (میں نے رسّی کے بیچ میں پکڑا) یا جلستُ وسطَ القوم (میں لوگوں کے درمیان میں بیٹھا) اموی حاکم حجاج بن یوسف نے کوفہ اور بصرہ کے بیچ میں ایک شہر بسایا تھا۔ اسی لیے اس کو واسط کہا جاتا تھا۔ کیوں کہ وہ ایک ایسا مقام تھا جو بصرہ اور کوفہ کے درمیان واقع تھا (سموہ واسطا لانہ مکان وسَطٌ بین البصرۃ والکوفۃ) لسان العرب ۷/۴۲۶-۴۳۲

الطبری نے نقل کیا ہے کہ وسَط سے مراد وہ چیز ہے جو دو کناروں کے بیچ میں ہو (الذی ھو بین الطرفین) ابن زید نے کہا کہ اس آیت کا مطلب یہ ہے کہ امت محمدی نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور دوسری قوموں کے درمیان ہے (ھم وسَط بین النبی صلی اللہ علیہ وسلم وبین الامم) تفسیر طبری ۲/۶-۸

یہ آیت کوئی فضیلت یا اعزاز کی آیت نہیں ہے۔ وہ امت مسلم کی دعوتی ذمہ داری کو بتاتی ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ ختم نبوت کے بعد یہ امت رسولؐ اور رہم اپنی ہم عصر قوموں کے درمیان ہے۔ اس کو رسولؐ سے لے کر دوسری قوموں تک پہنچانا ہے۔ دعوتی عمل میں اس کو درمیانی ذریعہ کا کردار ادا کرنا ہے۔

یہ ایک بے حد نازک کام ہے۔ کیوں کہ یہ گویا اہل عالم کے سامنے خدا کے رسولؐ کی نمائندگی ہے۔ ایک طرف امت مسلم کی یہ ذمہ داری ہے کہ وہ پہنچانے کا یہ کام ضرور کرے۔ اگر اس نے نہیں پہنچایا تو یہ اس کے حق میں ایک ناقابل معافی کوتاہی ہوگی۔ دوسری طرف اس کام میں انتہائی احتیاط برتنا ہے۔ یعنی دوسروں تک عین وہی بات پہنچانا ہے جو رسولؐ کی بات ہے، اس میں کسی بھی قسم کا انحراف اس کے لیے جائز نہیں۔

امت محمدی کی پہلی ذمہ داری یہ ہے کہ وہ خود اپنی زندگی کو دین دار بنائے۔ اس کی دوسری ذمہ داری یہ ہے کہ وہ درمیانی کردار ادا کرتے ہوئے دوسروں کو دین کی دعوت دے۔

محتسبِ اقوام یا خیر خواہِ اقوام

ایک مسلم رہنما نے لکھا ہے کہ مسلمان اپنے عقیدہ کی رو سے محتسبِ اقوام ہیں۔ ایک اور رہنما نے لکھا ہے کہ مسلمان تمام قوموں کے اوپر خدائی فوجدار ہیں۔ تقریباً ایک صدی سے یہی بات ایک یا دوسرے لفظ میں کہی جا رہی ہے۔ شاعر اور خطیب اور انشا پرداز قسم کے لیڈر اس بات کو نہایت جذباتی انداز میں بیان کرتے رہے ہیں۔ حتیٰ کہ اب موجودہ مسلم نسل کا یہی عام ذہن بن گیا ہے۔ خاص طور پر مسلمانوں کا نوجوان طبقہ ہر جگہ اسی احساس حاکیت سے سرشار نظر آتا ہے۔ اور یہی وہ خاص نفسیات ہے جس کے تحت مسلم نوجوان ساری دنیا میں ان سرگرمیوں میں مشغول ہیں جن کو وہ بطور خود انقلابی سرگرمی کہتے ہیں اور دوسرے لوگوں نے جس کو توڑ پھوڑ اور دہشت گردی کا نام دیا ہے۔

مگر مسلمان کی شخصیت کے بارہ میں یہ حاکمانہ نظریہ سراسر لغو ہے۔ اس کا قرآن و حدیث سے کوئی تعلق نہیں۔ مسلمان کی حیثیت اس دنیا میں محتسبِ اقوام کی نہیں ہے، بلکہ خیر خواہِ اقوام کی ہے۔ مسلمان کو دعوت کی ذمہ داری سپرد کی گئی ہے۔ مسلمان دوسری قوموں کے سامنے خدا کے دین کا داعی ہے۔ داعی روحانی ڈاکٹر ہوتا ہے۔ جس طرح ایک سچا ڈاکٹر خیر خواہی کی حد تک اپنے مریض کا خدمت گار ہوتا ہے۔ اسی طرح سچا داعی وہ ہے جو خیر خواہی کی حد تک لوگوں کی ہدایت کا حریص بن جائے۔

داعی کے لیے قرآن میں ناصح (خیر خواہ) اور امین کا لفظ استعمال کیا گیا ہے۔ داعی بیک وقت دو شدید احساس کے درمیان ہوتا ہے۔ ایک طرف وہ سمجھتا ہے کہ وہ خدا کے دین کا امانت دار ہے۔ یہ احساس اس کے اندر آخری حد تک ذمہ داری کا جذبہ ابھار دیتا ہے۔ وہ اس ڈر سے کانپتا رہتا ہے کہ امانت کی ادائگی میں اگر ذرا بھی کوتاہی ہوئی تو وہ خدا کے یہاں پکڑا جائے گا۔ دوسری طرف بندوں کے ساتھ خیر خواہی کا احساس اس کو مجبور کرتا ہے کہ وہ ہر تلخی کو اپنی ذات پر سہتے ہوئے مدعو کو خدا کی رحمتوں کے سایہ میں لانے کی کوشش کرے۔

اس طرح جو انسان بنے وہ خیر خواہِ اقوام ہوگا نہ کہ محتسبِ اقوام۔ وہ لوگوں کی نجات کے لیے تڑپے گا نہ کہ لوگوں کے اوپر حاکمانہ اختیار استعمال کرنے کے لیے کھڑا ہو جائے۔

شہادت غیر حق

مولانا محمد علی جوہر (۱۹۳۱ - ۱۸۷۸) مشہور سیاسی لیڈر ہیں۔ وہ ۱۹۱۰ سے ۱۹۳۰ تک برصغیر ہند کی سیاست پر چھائے رہے۔ وہ ہندستان کو انگریز کے سیاسی اقتدار سے آزاد کرانا چاہتے تھے۔ اس سلسلہ میں ان کے بہت سے پرجوش واقعات بیان کیے جاتے ہیں۔

مولانا محمد علی کی آخر عمر میں لندن میں پہلی راؤنڈ ٹیبل کانفرنس ہوئی۔ وہ سمندری سفر کرکے وہاں پہنچے۔ ۴ جنوری ۱۹۳۱ کو انھوں نے کانفرنس میں ایک "معرکۃ الآراء" تقریر کی۔ اس تقریر میں انھوں نے کہا کہ واحد چیز جس کو لینے کا میں نے تہیہ کر رکھا ہے وہ مکمل آزادی ہے۔ میں ایک غلام ملک کو واپس نہیں جاؤں گا۔ میں اس کو پسند کروں گا کہ میں باہر کے ایک ملک میں مرجاؤں جب کہ وہ ایک آزاد ملک ہو۔ اور اگر آپ ہم کو ہندستان میں آزادی نہیں دیتے تو مجھے یہاں انگلینڈ میں آپ کو ایک قبر کی جگہ دینی پڑے گی:

The only thing to which I am committed is complete independence, I will not go back to a slave country. I would prefer to die in a foreign country so long as it is a free country. And if you do not give us freedom in India, you will have to give me a grave here (in England).

مذہب آزادی کے اعتبار سے یہ الفاظ بڑے شاندار معلوم ہوتے ہیں۔ مگر مذہب توحید کے اعتبار سے وہ بالکل بے قیمت ہیں۔ آزادی اور سیاست کے مذہب میں سب سے زیادہ اہمیت اس بات کی ہوتی ہے کہ کوئی قوم آزاد ہے یا محکوم۔ مگر مذہب توحید میں اس نوعیت کی تقسیم محض اضافی ہے۔

مذہب توحید (یا اسلام) کے نقطۂ نظر سے ساری اہمیت آخرت کی ہے۔ مومن کو سب سے زیادہ جس بات کا احساس ہوتا ہے وہ یہ کہ لوگ جہنم سے بچیں اور جنت کے راستہ کو اختیار کریں۔ قومی سیاست کو لے کر اٹھنے والے آدمی کی نظر میں سب سے زیادہ اہم مسئلہ آزادی اور محکومی کا ہوتا ہے۔ اس کے برعکس مومن کی نظر میں سب سے زیادہ اہم مسئلہ جنت اور جہنم کا ہوتا ہے۔ وہ دوسری تمام باتوں کو نظر انداز کرکے اسی ایک بات پر اپنی ساری توجہ لگا دیتا ہے۔ کیوں کہ حقیقی مسئلہ صرف وہ ہے جو ابدی زندگی سے تعلق رکھتا ہو، باقی تمام مسائل اضافی اور غیر حقیقی ہیں۔

راؤنڈ ٹیبل کانفرنس میں مولانا محمد علی کی تقریر شہادت غیر حق کی مثال ہے۔ انھوں نے انگریزوں

کے سامنے یہ گواہی دی کہ سیاسی محکومی سے نجات سب سے بڑا مسئلہ ہے، حالاں کہ انھیں یہ گواہی دینا چاہئے تھا کہ جہنم کے عذاب سے نجات سب سے بڑا مسئلہ ہے۔ انھوں نے انگریزوں کو بتایا کہ سب سے زیادہ اعلیٰ چیز سیاسی آزادی ہے۔ حالاں کہ انھیں چاہئے تھا کہ انگریزوں کو یہ بتائیں کہ سب سے زیادہ اعلیٰ چیز جنت ہے۔ اس لئے تم لوگ اپنے رب کی رحمت و مغفرت کے طالب بنو تاکہ تم موت کے بعد جنت میں داخل ہو:

وسارعوا الیٰ مغفرۃ من ربکم وجنۃ عرضہا السماوات والارض اعدت للمتقین (آل عمران ۱۳۳)	اور تم لوگ اپنے رب کی بخشش کی طرف دوڑو اور اس جنت کی طرف جس کی وسعت آسمانوں اور زمین کے برابر ہے۔ وہ اللہ سے ڈرنے والوں کے لئے تیار کی گئی ہے۔

پیغمبروں کی تاریخ بتاتی ہے کہ ان کے زمانہ میں بھی سیاسی محکومی کے مسائل تھے۔ مگر وہ سیاسی محکومی سے نجات کا نعرہ لے کر نہیں اٹھے۔ بلکہ لوگوں کو توحید اور آخرت کی طرف پکارا۔

مثال کے طور پر حضرت یوسف علیہ السلام کے زمانہ میں مصر میں ایک بیرونی خاندان ہکسوس (Hyksos Kings) کی حکومت تھی۔ مگر حضرت یوسف نے اس بیرونی حکمرانی کو اشو نہیں بنایا جیسا کہ آپ کے بعد مصر کے قوم پرستوں نے بنایا۔ حتی کہ آپ اسی بیرونی بادشاہ کے تحت "خزائن ارض" کے شعبہ کے نگراں بن گئے۔

حضرت مسیح علیہ السلام کے زمانہ میں فلسطین میں رومیوں کی حکومت تھی جو باہر سے آکر فلسطین پر قابض ہو گئے تھے۔ اس وقت فلسطین میں پیلاطس (Pontius Pilate) رومی گورنر کی حیثیت سے مقیم تھا۔ مگر حضرت مسیح نے اس معاملہ کو اپنی تحریک کا اشو نہیں بنایا۔ آپ نے اپنی ساری توجہ اس پر مرتکز کر دی کہ لوگوں کو جہنم سے ڈرائیں اور انھیں جنت کی بشارت دیں۔

مومن کا کام یہ ہے کہ وہ توحید اور آخرت کو اپنی دعوت کا عنوان بنائے اور دوسری تمام چیزوں کو فیصلۂ الٰہی کے خانہ میں ڈال دے۔ مومن کا کام حق کی گواہی دینا ہے۔ اہل ایمان اگر دوسری دوسری چیزوں کو تحریک کا عنوان بنا کر اس کے لئے دھوم مچائیں تو یہ غیر حق کی شہادت کے ہم معنی ہوگا۔ اور اہل ایمان کے لئے جس خدائی نصرت کا وعدہ کیا گیا ہے وہ شہادت حق کے کام پر ہے۔ شہادت غیر حق کے کام پر انھیں ہرگز خدا کی نصرت ملنے والی نہیں۔

معجزہ کیا ہے

معجزہ کے لفظی معنی ہیں عاجز کر دینے والا۔ پیغمبروں کو معجزات اسی لیے دیے گئے تاکہ لوگ ان کی صداقت کا اعتراف کرنے پر مجبور ہو جائیں۔ معجزہ کو مخاطب کے اپنے میدان کے اعتبار سے معجز ہونا چاہیے۔ کیوں کہ آدمی کو جب تک اپنے مخصوص میدان میں عجز کا تجربہ نہ ہو وہ صحیح طور پر اس کی اعجازی حیثیت کا احساس نہیں کر سکتا۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام، جن کا زمانہ چودھویں اور تیرھویں صدی قبل مسیح ہے، انھوں نے مصر کے جادوگروں کے سامنے دعوتی تقریر کی۔ مگر وہ اس سے متاثر نہ ہو سکے۔ لیکن جب انھوں نے جادوگروں کے سانپوں کے مقابلہ میں زیادہ بڑے سانپ کا کرشمہ دکھایا تو تمام جادوگر سجدہ میں گر پڑے۔

اس کی وجہ یہ ہے کہ حضرت موسیٰؑ کے نظریاتی دلائل کا وزن محسوس کرنے کے باوجود اپنے مخصوص میدان میں پھر بھی وہ اپنے آپ کو موسیٰ سے فائق سمجھ رہے تھے۔ مگر موسیٰ کا عصا جب ان کے سانپوں سے زیادہ بڑا سانپ بن کر ظاہر ہوا تو حضرت موسیٰ کی عظمت آخری طور پر ان کے اوپر منکشف ہو گئی۔ اس کے بعد ان کے لیے اس کے سوا کوئی چارہ نہ رہا کہ وہ دل سے حضرت موسیٰ کا اعتراف کر لیں۔

اسی لیے پیغمبروں کو جو معجزہ دیا جاتا ہے وہ مخاطب کے اپنے میدان کے اعتبار۔

مصر کے جادوگروں کو یہ فخر تھا کہ وہ رسیوں کو سانپ کی صورت دے سکتے ہیں۔ تو حضـ

زیادہ بڑا سانپ بنا کر انھیں دکھایا گیا۔ شام و فلسطین کے طبیب عام مریضوں کو ا

کو یہ خصوصیت دی گئی کہ ناقابل علاج امراض میں مبتلا لوگ صرف ان۔

عرب کے لوگوں کو اپنے ادب پر فخر تھا تو پیغمبر اسلامؐ کو قرآن کی صور

ان کے تمام ادبی شہ پارے ہیچ نظر آنے لگے اور کہنے وا

خدا کا داعی اپنی ذات میں اپنی صداقـ

نہیں کر پاتے۔ اس وقت خدا یہ کرتا۔

مقابلہ میں زیر کر دیتا ہے۔ ایسا"

او پر ناقابل انکار درجہ میں واضح ہو

سیاست نہیں آخرت

یہ ۲۷ ستمبر ۱۹۷۲ کا واقعہ ہے۔ مولانا سید اسعد مدنی، صدر جمعیۃ علماء ہند مصر اور سعودی عرب کے سفر سے واپس لوٹے تھے۔ مسجد عبد النبی (نئی دہلی) میں ایک مجلس تھی۔ لوگ مولانا سے سوال کر رہے تھے اور مولانا لوگوں کو ان کے سوال کا جواب دے رہے تھے۔ سوالات کے دوران ایک صاحب نے پوچھا: مولانا موجودہ حالات میں مسلمانوں کو کیا کرنا چاہیے۔ مولانا اسعد مدنی نے اس کے جواب میں کہا:

"مسلمان جب تک سیاست کے غم میں مبتلا رہے گا، وہ کبھی کامیاب نہیں ہو سکتا۔ یہ اسلام کی نہایت غلط تشریح ہے کہ انبیاء علیہم السلام سیاسی نظام قائم کرنے کے لیے آتے تھے۔ انبیاء کے سامنے اصلاً آخرت ہوتی تھی۔ وہ لوگوں کو خدا کے غضب سے ڈراتے تھے۔ ان کا حال اس باپ کا سا ہوتا تھا جس کا لڑکا آگ کے شعلہ میں گر رہا ہو اور وہ اس کو اس سے کھینچنے کی کوشش کرے۔ اس سلسلہ میں سب سے بڑا نقصان مسلم لیگ نے پہونچایا ہے۔ تقسیم کی تحریک نے نفرت کی جو آگ پھیلائی، اس نے ملک کے دونوں فرقوں کو ایک دوسرے سے اتنا دور کر دیا کہ اب ہماری کوئی بات صحیح روشنی میں دیکھی نہیں جاتی۔ تعصب کے جواب میں جو تعصب پیدا ہوا، اس نے ساری راہیں مسدود کر دیں۔ میں نے حضرت رحمۃ اللہ علیہ (مولانا سید حسین احمد مدنی) سے سنا ہے کہ کلکتہ کی مسجد جو دناخدا کے نام سے مشہور ہے، صرف اس ایک مسجد میں تقسیم سے پہلے یہ حال تھا کہ ہر روز تقریباً و آدمی آکر اسلام قبول کرتے تھے (تقسیم سے پہلے کچھ دنوں تک مولانا حسین احمد مدنی مسجد ناخدا ہتے تھے) یہی کیفیت پہلے سارے ملک میں تھی۔ ہر روز لوگ سیکڑوں کی تعداد میں اسلام کے ٔل ہو رہے تھے۔ یہ سب کچھ تقسیم کی منافرت کی پالیسی کے نتیجہ میں ختم ہو گیا۔" (الجمعیۃ ویکلی، چ ۱۹۷۳، صفحہ ۳)

سلمانوں کی سب سے بڑی غلطی یہی ہے۔ مسلمانوں پر لازم ہے کہ وہ ہر قیمت پر ُردوبارہ زندہ کریں۔ اگر انھوں نے ایسا نہیں کیا تو اندیشہ ہے کہ وہ خدا کے قانون اور پھر کوئی چیز نہ ہوگی جو انھیں خدا کی پکڑ سے بچا سکے۔

تاریخ کا ایک صفحہ

سترہ سال پہلے کی بات ہے۔ راقم الحروف نے "تاریخ سے سبق" کے عنوان سے ایک مضمون شائع کیا تھا۔ اس میں سیاسی پارٹیوں کے حالات کا ذکر کرتے ہوئے لکھا تھا کہ اسلامی تحریک کو سیاسی انداز سے نہیں چلایا جا سکتا۔ موجودہ زمانہ میں انسان عام طور پر اس انداز میں سوچتا ہے کہ سماج کے سیاسی اور اقتصادی ڈھانچہ کو کس طرح بدلا جائے اور اس کو کس طرح نئی بنیادوں پر قائم کیا جائے۔ ماحول میں اس طرز فکر کا رواج اسلام کے خادموں کے لیے "فتنہ" کی حیثیت رکھتا ہے۔ اگر ہم نے اس سے بچنے کی کوشش نہ کی تو ہم خدا کے دین کو سیاست بنا کر رکھ دیں گے "اور اس کے بعد ان تمام نتائج سے دوچار ہوں گے جو سیاسی تحریکوں کے لیے مقدر ہیں" (زندگی رامپور، ذی الحجہ ۱۳۷۹ھ)

اس کے بعد اگلے سال بدایوں (یوپی) میں مسلمانوں کا ایک بڑا دینی اجتماع ہوا جس میں دوبارہ اظہار خیال کا موقع ملا۔ اس موقع پر راقم الحروف نے ۱۹ اپریل ۱۹۶۱ء کی نشست میں ایک مفصل تقریر کی۔ یہ تقریر اسی زمانہ میں "قرآن کا مطلوب انسان" کے عنوان سے رسالہ زندگی رام پور میں شائع ہوئی تھی۔ اس کا ایک حصہ یہاں رسالہ مذکور کے قدیم فائل سے نقل کیا جا رہا ہے:

"یہ دنیا امتحان کی جگہ ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اس کی تمام چیزوں کو اس ڈھنگ پر بنایا گیا ہے کہ ایک ہی چیز سے آدمی نصیحت بھی حاصل کر سکتا ہے اور وہی بیک وقت اس کے لیے فتنہ میں پڑنے کا بھی ذریعہ ہے —— یہی حال خدا کی کتاب کا بھی ہے۔ بلاشبہ قرآن کتاب ہدایت ہے۔ مگر قرآن سے آدمی کو وہی کچھ ملے گا جو وہ اس سے حاصل کرنا چاہتا ہے۔

قرآن کے ذریعہ بے راہ ہونے کی ایک صورت وہ ہے جس کو قرآن میں مضاہات کہا گیا ہے (توبہ ۳۰) مضاہات کے معنی عربی زبان میں ہیں: مشاکلۃ الشئ بالشئ (لسان العرب) یعنی کسی چیز کو دوسری چیز کے ہم شکل قرار دینا۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ دنیوی مصالح کی بنا پر اجنبی خیالات سے متاثر ہو کر ایک غیر قرآنی بات کو قرآنی بنا کر پیش کیا جائے۔

مضاہاۃ کی یہ خرابی آدمی کے اندر خاموشی کے ساتھ داخل ہو جاتی ہے۔ یہ خیال کہ جو بات

لوگوں سے کہنی ہے وہ ایسی ہونی چاہیے جو لوگوں کے ذہن سے قریب تر ہو تاکہ وہ اس کو قبول کر سکیں اور دوسرے یہ کہ بات کو ایسے الفاظ اور اصطلاحات میں پیش کیا جائے کہ وقت کا معیار فکر اس کی اہمیت کو تسلیم کرنے پر مجبور ہو، وقت کے علمی خیالات کے ساتھ وہ پہلو بہ پہلو جگہ لے سکے۔ یہ طرز اگرچہ بذات خود غلط نہیں ہے مگر بعض مرتبہ وہ آدمی کے ذہن میں خدائی تعلیمات کی ایسی تصویر بنا دیتا ہے جو اصل تعلیمات سے زیادہ وقت کے نظریات سے مطابقت رکھنے والا ہو۔ خدائی تعلیمات سے جزوی مشابہت تو ضرور اس میں موجود رہتی ہے مگر درحقیقت وہ اسلامی الفاظ اور اصطلاحات میں غیر اسلامی خیالات کی ترجمانی ہوتی ہے۔

اگر بے جا جسارت نہ ہو تو میں عرض کروں گا کہ تصوف جو بعض محققین کے نزدیک یونانی لفظ تھیوسوفیا (Theosophia) کی تعریب ہے، وہ بھی اسی نوعیت کا ایک واقعہ ہے جو دوسری صدی ہجری کے نصف آخر میں محض خارجی اثرات کے تحت اسلام کے اندر داخل ہو گیا۔ ہمارے قدیم بزرگ جب اسلام کا پیغام لے کر عرب کے باہر دوسرے ملکوں میں گئے تو انھوں نے اپنے آپ کو ایک ایسی دنیا میں پایا جہاں کچھ مخصوص افکار و اشغال لوگوں کے ذہنوں پر چھائے ہوئے تھے اور مذہب اور مذہبی زندگی کا تصور ان کے بغیر نہیں کیا جا سکتا تھا۔ یہی نہیں بلکہ ان افکار و اشغال کی پشت پر ایک زبردست فلسفہ بھی موجود تھا۔ ان چیزوں نے کچھ دعوتی مصلحت اور کچھ انفعالی تاثر کے تحت ہمارے بزرگوں کو آمادہ کیا کہ وہ اسلام کو اس رنگ میں پیش کریں جس سے لوگ پہلے سے مانوس ہیں۔ اس طرح نبوت کے دو سو سال بعد اسلام کی متصوفانہ تعبیر ہماری تاریخ میں داخل ہو گئی۔

اب قدیم روحانی انداز میں سوچنے کا زمانہ ختم ہو رہا ہے اور ہم ایک ایسی دنیا میں سانس لے رہے ہیں جبکہ ہر طرف معاشی اور سیاسی تحریکوں کا زور ہے۔ آج کا انسان عام طور پر اس انداز میں سوچتا ہے کہ موجودہ سماجی ڈھانچہ کو بدل کر کسی اور بنیاد پر دنیا کا نظام چلایا جائے۔

قانون فطرت

ایک دعوت سچے اسلام کی دعوت ہو اور آپ اس کا انکار کریں تو یہ انکار ہمیشہ جنت کی قیمت پر ہوتا ہے۔ ایسی ایک دعوت کا انکار کر کے آدمی دنیا میں اپنے کو وقتی رسوائی سے بچاتا ہے اور آخرت کی ابدی رسوائی کا خطرہ مول لیتا ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ بہت مہنگا سودا ہے۔ اس لئے جب ایک اسلامی دعوت کے مقابلہ میں اپنے رویہ کا فیصلہ کرنا ہو تو آدمی کو بے حد سنجیدہ غور و فکر کے بعد اس کا فیصلہ کرنا چاہئے۔

اس سلسلہ میں ایک اور سنگین بات ہے جو آدمی کو خوب اچھی طرح سمجھ لینا چاہئے۔ وہ اللہ کی سنت اشتباہ ہے۔ قرآن میں بتایا گیا ہے کہ رسول کے مخاطبین نے جب رسول کی دعوت کا انکار کیا تو انھوں نے کہا کہ خدا کو اگر اپنا پیغمبر بھیجنا تھا تو اس نے انسان کو کیوں ہمارے پاس بھیجا، فرشتہ کو کیوں نہ بھیجا۔ تاکہ ہم کو پہچاننے میں شبہ نہ ہوتا اور ہم اس کو خدا کا نمائندہ مان کر فوراً اس کے مومن بن جاتے۔ فرمایا کہ انسانی پیغمبر کے بجائے اگر ہم کوئی فرشتہ بھیجتے تو اس کو بھی فرشتہ کے طور پر نہ بھیجتے بلکہ انسان کی صورت میں بھیجتے۔ اور اس طرح دوبارہ ان کو اسی شبہ میں ڈال دیتے جس میں وہ اب پڑے ہوئے ہیں (انعام ۹) چونکہ یہ دنیا امتحان کی جگہ ہے اس لئے یہاں لازماً حق پر التباس کا پردہ ڈال کر لوگوں کے سامنے لایا جاتا ہے۔ یہاں "خدا کے نمائندہ" کو بھی ایک عام انسان کی صورت میں پیش کیا جاتا ہے تاکہ لوگوں کے لئے شبہ کی گنجائش باقی رہے۔

یہی جانچ کا مقام ہے۔ اللہ یہ دیکھنا چاہتا ہے کہ وہ کون ہے جو شبہ کے پردہ کو پھاڑ کر حق کو اس کی برہنہ صورت میں دیکھ لیتا ہے اور کون ہے جو شبہ میں اٹک کر رہ جاتا ہے۔ خدا کے منصوبہ کے مطابق انسان کو بہر حال اس امتحان میں کھڑا ہونا ہے کہ وہ ایک مخلوق کی صورت میں خالق کی تجلیات کو دیکھے۔ ایک انسان کی آواز میں خدا کی آواز کو سنے۔ دنیوی شان و شوکت سے خالی ایک دعوت میں آخرت کی شان و شوکت کی رونقیں پالے۔

اس کا مطلب یہ ہے کہ آدمی کو اگر حق کا انکار کرنے کے لئے ایک "دلیل" ہاتھ آگئی ہو تو اس کو ہرگز یہ نہ سمجھنا چاہئے کہ وہ اپنے رویہ کے حق میں ایک مضبوط بنیاد کو پا گیا ہے۔ عین ممکن ہے کہ وہ جس چیز کو دلیل سمجھ رہا ہے وہ محض ایک فریب ہو۔ اس کے ذہن نے شبہات سے متاثر ہو کر بطور خود ایک تصویر بنالی ہو۔ وہ اس کا ایک ذہنی سایہ ہو جس کو وہ حقیقت سمجھ بیٹھا ہو۔ "شبہ میں ڈالنے" کی سنت ہی کا یہ تقاضا ہے کہ حق اگر اپنی موافقت میں دلیلیں رکھتا ہو تو اسی کے ساتھ آدمی کو اس کی مخالفت میں بھی دلیلیں ہاتھ آجائیں۔ اگر ایسے پہلو پائے جاتے ہوں جو دعوت کو سچی دعوت ثابت کرتے ہوں تو اسی کے ساتھ یہ امکان بھی موجود ہو کہ کوئی شخص اس میں ایسے شوشے دریافت کرے جس کی بنیاد پر وہ اس کی گمراہی کا انکشاف کر سکے۔ قرآن میں ہے کہ "کون ہے جو اللہ کو قرض دے" اس کو دیکھ کر ایک شخص نے کہا۔ "خدا بھی محتاج ہو گیا ہے جو اس کو بندوں سے ادھار مانگنے کی ضرورت پڑی"۔ اگر آدمی کا ذہن صحیح نہ ہو تو وہ خدا کی کتاب میں بھی احمقانہ اعتراضات تلاش کر سکتا ہے۔ اب اگر کوئی کہے کہ قرآن میں "قرض" کے بجائے کوئی دوسری تعبیر اختیار کرنی چاہئے تھی تو یہ بے معنی بات ہوگی۔ کیوں کہ قرض کا لفظ اگر قرآن میں نہ ہوتا تو آدمی اپنے بے معنی اعتراضات کے لئے کوئی اور لفظ تلاش کر لیتا۔

دعوت الی اللہ

مصطفیٰ محمد عمارۃ کی ایک کتاب ہے جس کا نام ہے: جواہر البخاری وشرح القسطلانی۔ اس کتاب میں امام بخاری اور شیخ قسطلانی کی کتابوں سے ۸۰۰ سے زیادہ حدیثیں منتخب کر کے مختلف عنوانات کے تحت درج کی گئی ہیں۔ ضخیم کتاب میں ہر قسم کے عنوانات ہیں مگر "دعوت الی اللہ" یا اس کے ہم معنی کوئی عنوان موجود نہیں۔

اس کا مطلب یہ نہیں کہ مصنف کو دعوت و تبلیغ سے متعلق احادیث پہنچیں نہیں۔ انہوں نے جن حدیثوں کو پڑھا اور سنا ان میں یقیناً دعوت و تبلیغ والی حدیثیں موجود تھیں۔ مگر ذہن کی مخصوص ساخت کی وجہ سے وہ ان کے ذہن کا جزء نہ بن سکیں۔

خود مصنف کی زیر نظر کتاب سے ثابت ہے کہ ان کو دعوت و تبلیغ کی احادیث پہنچیں تھیں۔ مگر ان کے ذہن سے ان کا دعوتی مفہوم اوجھل رہ گیا۔ چنانچہ انہوں نے ان احادیث کو دعوت و تبلیغ کے خانہ میں درج نہیں کیا بلکہ کسی اور خانہ میں ان کو نقل کر دیا۔

کتاب کے صفحہ ۴۹۶ پر یہ حدیث ملتی ہے:

عن ابی موسی الاشعری قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم، مثلی ومثل ما بعثنی اللہ بہ کمثل رجل اتی قوماً فقال رأیت الجیش بعینیّ وانی انا النذیر العریان فالنجاءَ النجاءَ فاطاعتہ طائفۃ فادلجوا علی مہلهم فنجوا وکذبتہ طائفۃ فصبحهم الجیش فاجتاحهم۔

ابو موسی اشعریؓ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا میری مثال اور اس چیز کی مثال جس کو لے کر خدا نے مجھے بھیجا ہے اس آدمی کی سی ہے جو ایک قوم کے پاس آیا اور کہا کہ میں نے اپنی دونوں آنکھوں سے دشمن کا لشکر دیکھا ہے اور میں تم کو کھلا ڈرانے والا ہوں بس بچو بچو۔ پھر ایک گروہ نے اس کی بات مانی اور رات کو سویرے چل پڑا اور وہ بچ گیا۔ دوسرے گروہ نے نہ مانا چنانچہ صبح کو دشمن کا لشکر اس پر ٹوٹ پڑا اور اس کو ہلاک کر ڈالا۔

اس حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اللہ تعالیٰ نے مبعوث فرمایا تو اس کا خاص مقصد یہ تھا کہ آپ لوگوں کے سامنے "نذیر عریاں" بن جائیں اور ان کو قیامت کے

اُنے والے ہولناک دن سے آگاہ کردیں۔ جو شخص آپ کی بات مان کر اپنی اصلاح کرلے گا وہ جنت میں جائیگا۔ اور جو شخص آپ کی بات نہیں مانے گا اور اس کے مطابق اپنے کو درست نہیں کرے گا اس کا ٹھکانا جہنم ہوگا۔

یہ حدیث واضح طور پر دعوت و تبلیغ کے بارہ میں ہے مگر صاحب کتاب نے اس کو جس عنوان کے تحت درج کیا ہے وہ یہ ہے:

باب الخوف من الله تعالى والانتهاء عن المعاصى والجنة قريبة۔

اللہ تعالیٰ کا خوف اور گناہوں سے رکنا اور یہ کہ جنت قریب ہے۔

بعد کے زمانہ میں لکھی جانے والی اکثر کتابوں کا یہی حال ہے۔ ان کتابوں میں آپ طہارت سے لے کر قتال تک کے تمام ابواب پائیں گے۔ مگر دعوت الی اللہ اور تبلیغ ما انزل اللہ کا اس میں کوئی باب نہ ہوگا۔ یہ صرف عام مصنفین کا حال نہیں ہے بلکہ بڑے بڑے علماء اور مصنفین بھی اس سے مستثنیٰ نہیں۔

یہی سبب ہے کہ بعد کے دور میں مسلمانوں میں ہم ہر طرح کی سرگرمیاں دیکھتے ہیں مگر دعوت الی اللہ اور شہادت حق کی سرگرمی ہمیں ان کے یہاں نظر نہیں آتی۔ اگرچہ اسلام کی اشاعت کا کام کسی بھی دور میں بند نہیں ہوا۔ ہر دور میں خدا کے بندے بے شمار تعداد میں خدا کے دین میں داخل ہوتے رہے اور آج بھی داخل ہو رہے ہیں۔ مگر یہ سب زیادہ تر اسلام کی اپنی قوت سے ہو رہا ہے نہ کہ شعوری طور پر مسلمانوں کی کسی دعوتی جدوجہد سے۔

بعد کی تاریخ میں مسلمانوں کے درمیان پیدا ہونے والی یہ سب سے بڑی کمی ہے جس نے مسلمانوں کو غیر مسلمین کے مقابلہ میں خدا کی نصرت سے محروم کر دیا ہے، جب تک اس کمی کو دور نہ کیا جائے مسلمانوں کو کبھی دنیا میں برتری کا مقام حاصل نہیں ہو سکتا۔

موجودہ زمانہ میں بظاہر مسلمانوں کے درمیان "دعوت اسلامی" کا کافی چرچا نظر آر ہا ہے۔ مگر ان کی کارروائیوں کو دیکھنے اور ان کی کانفرنسوں میں شرکت کے بعد میرا احساس یہ ہے کہ مختلف اسباب سے لوگ دعوت کا نام تو لے رہے ہیں۔ مگر شاید ان پر یہ واضح نہیں کہ دعوت سے حقیقۃً کیا مراد ہے۔ لوگ سیاسی ہنگامے برپا کرتے ہیں اور قومی مسائل پر پرجوش تقریریں کرتے ہیں اور اسی کو دعوت کا عنوان دے رہے ہیں۔ حالانکہ دعوت خدائی پیغام رسانی کا نام ہے نہ کہ قومی اور مادی ہنگامہ آرائی کا۔

ایک تشریح

مشہور حدیث کے مطابق، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ تم میں سے جو شخص کسی منکر کو دیکھے تو وہ اس کو اپنے ہاتھ سے بدل دے۔ اگر اس کی استطاعت نہ ہو تو زبان سے اس کو بُرا کہے۔ اور اگر اس کی استطاعت بھی نہ ہو تو دل میں اس کو برا سمجھے، اور یہ سب سے کمزور ایمان ہے۔

اس حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ برائی پر صبر کرنا رخصت کی بات ہے، وہ مومن کے لیے عزیمت یا اعلیٰ درجہ کی پسندیدہ بات نہیں۔

دوسری طرف قرآن میں ایک سے زیادہ مقام پر فرمایا گیا ہے کہ صبر کرو، کیوں کہ صبر کرنا عزیمت کی بات ہے۔ وہ اولوالعزم پیغمبروں کا طریقہ ہے (الاحقاف ۳۵) یہ دونوں باتیں بظاہر ایک دوسرے سے ٹکراتی ہیں۔ پھر ان کے درمیان تطبیق کیا ہے۔

اصل یہ ہے کہ دونوں حکم الگ الگ موقع کے لیے ہیں۔ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کی جو حدیث ہے، اس کا تعلق مسلم سوسائٹی سے ہے۔ اور صبر کی مذکورہ آیتوں کا تعلق غیر مسلموں میں دعوت وتبلیغ سے ہے۔ دونوں حکموں کا محل ایک دوسرے سے جدا ہے۔

مسلم معاشرہ کی داخلی اصلاح کے لیے یہ مطلوب ہے کہ ہر مسلمان کے اندر امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کی اسپرٹ موجود ہو۔ ایک مسلمان دوسرے مسلمان پر زیادتی کرے تو پورا معاشرہ اس کا سخت نوٹس لے۔ لوگ ظالم کا ہاتھ پکڑنے کے لیے دوڑیں۔ زبان سے اس کی مذمت کریں۔ اور بالفرض کوئی مسلمان ایسا کرنے کی حالت میں نہ ہو تو اس قسم کا واقعہ دیکھ کر اس کے دل میں سخت کراہت پیدا ہونی چاہیے۔ اگر یہ بھی نہ ہو تو ایسے آدمی کا ایمان ہی مشتبہ ہو جائے گا۔

مگر جہاں تک دعوت کے عمومی کام کا تعلق ہے، اس میں عزیمت یہی ہے کہ صبر کیا جائے۔ یہاں مدعو کی زیادتیوں پر صبر کرنا لازمی طور پر ضروری ہے۔ اگر مدعو کی زیادتیوں پر صبر نہ کیا جائے تو داعی اور مدعو کے درمیان وہ معتدل فضا ہی نہیں بنے گی جو دعوتی عمل کی صحیح انجام دہی کے لیے ضروری ہے۔

احیاء ملت

احیاء امت کا کام اصلاً احیاء افراد کا کام ہے۔ یہ کام اسٹیج کی تقریروں اور جلسہ جلوس کے ہنگاموں کے ذریعہ نہیں ہو سکتا۔ اور نہ اس کو جماعتی اور تنظیمی ڈھانچہ بنا کر حاصل کیا جا سکتا ہے۔ اس کام کے لیے خاموش قسم کی فکری مہم درکار ہے جس کو موثر ترین سطح پر اٹھایا جائے اور اس کو ہر طرف سے یکسو ہو کر مسلسل چلایا جاتا رہے۔ یہاں تک کہ لوگوں کے اندر مطلوبہ ذہنی انقلاب آجائے۔ امت میں نئی سوچ اور نیا مزاج رکھنے والے افراد پیدا ہو جائیں۔

یہ افراد وہ ہیں جو اسلام کو از سر نو دریافت کریں۔ جن کی معرفت اتنی بڑھے کہ براہ راست خدا سے ان کا اتصال قائم ہو جائے۔ صبح و شام ان کو رزق رب ملنے لگے۔ پوری دنیا ان کے لیے ایمانی غذا کا دستر خوان بن جائے۔ آخرت کا استحضار ان کے اوپر اتنا طاری ہو گویا کہ وہ جنت اور جہنم کو دیکھ رہے ہیں۔ اس کا نتیجہ یہ نکلے کہ ان کی زندگی عمل صالح کا نمونہ بن جائے۔ وہ اس احساس کے ساتھ بولیں کہ ان کے الفاظ انسانوں تک پہنچنے سے پہلے خدا تک پہنچ رہے ہیں۔ وہ جو کچھ کریں یہ سوچ کر کریں کہ وہ اپنے ہر عمل کے لیے مالک کائنات کے سامنے جواب دہ ہیں۔ ان کا ایک شخص جب دوسرے شخص کے ساتھ معاملہ کرے تو اس کو نظر آرہا ہو کہ ان کے ساتھ ایک تیسرا بھی شریک ہے اور وہ اللہ ہے۔

ایمان کے اثر سے ان کا شعور اس طرح جاگ اٹھے کہ وہ چیزوں کو ویسا ہی دیکھنے لگیں جیسا کہ وہ فی الواقع ہیں۔ وہ دلیل اور مغالطہ کے درمیان تمیز کرنے لگیں۔ وہ شعوری طور پر جان لیں کہ کب دو چیزوں میں ظاہری مشابہت کے باوجود فرق ہوتا ہے اور کب دو چیزوں میں ظاہری فرق کے باوجود مشابہت۔ وہ عسر کے حالات میں یسر کے سرے کو پالیں۔ وہ اس حقیقت کا ادراک کرلیں کہ مومن بننے کے بعد ان کی حیثیت داعی کی ہو چکی ہے اور بقیہ لوگوں کی حیثیت مدعو کی۔ اور جہاں دو گروہوں کے درمیان داعی اور مدعو کی نسبت قائم ہو جائے وہاں سارا معاملہ یک طرفہ ہو جاتا ہے۔ کیونکہ مدعو کے اوپر داعی کا کوئی حق نہیں، اس کی صرف ذمہ داریاں ہی ذمہ داریاں ہیں جن کو اسے آخری حد تک ادا کرنا ہے اور ان کو ادا کرتے ہوئے اسے اپنے رب تک پہنچ جانا ہے۔

مدافعت نہ کہ جارحیت

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بعثت کے بعد مکہ میں تیرہ سال تک رہے۔ اس مدت میں مکہ کے منکروں کی طرف سے ہر قسم کا ظلم کیا گیا۔ مگر آپ صرف صبر کرتے رہے۔ آپ اپنے ساتھیوں سے ہمیشہ یہ کہتے کہ اپنے ہاتھ روکے رکھو (کفوا ایدیکم) ہجرت کے بعد قریش سے لڑائیاں شروع ہوئیں۔ مگر یہ لڑائیاں آپ کے لئے مدافعانہ لڑائیاں تھیں۔ کیونکہ ان لڑائیوں میں جارحیت کا مظاہرہ اولاً قریش کی طرف سے کیا گیا (وھم بدؤکم اول مرۃ) سورۂ بقرہ میں مسلمانوں کو جنگ کا حکم دیتے ہوئے کہا گیا ہے وقاتلوا فی سبیل اللہ الذین یقاتلونکم (۱۹۰) اس کی تشریح میں حضرت عبد اللہ بن عباس رضؓ کہتے ہیں: ای الذین یبدؤنکم بالقتال (یعنی ان سے جنگ کرو جنھوں نے تم سے جنگ میں ابتدا کی ہے)

ابتدائی تین بڑے غزوات مدینہ کی سرحد پر یا اس سے بہت قریب ہوئے۔ مدینہ سے مکہ کا فاصلہ ۲۰۰ میل ہے۔ مگر اسلام کا پہلا غزوہ بدر (رمضان ۲ھ) بدر نامی مقام پر ہوا جو مدینہ سے صرف ۲۰ میل کے فاصلہ پر ہے۔ دوسرا بڑا غزوہ احد (شوال ۳ھ) احد پہاڑ کے پاس ہوا جو مدینہ سے ۲ میل کے فاصلہ پر ہے۔ تیسرا بڑا غزوہ احزاب (ذی قعدہ ۵ھ) عین مدینہ کی سرحد پر ہوا۔ گویا ہر بار آپ کے مخالفین چڑھائی کر کے آپ کے مقام پر آئے۔ نہ کہ آپ چڑھائی کر کے ان کے مقام پر گئے۔

ان غزوات کا جغرافی محل وقوع ہی یہ ثابت کرنے کے لئے کافی ہے کہ آپ کے مخالفین نے آپ پر جارحانہ اقدام کیا تھا اور آپ صرف مدافعت میں ان کا مقابلہ کرنے کے لئے نکلے۔ یہ عملی دلیل اتنی واضح ہے کہ اس کے بعد کسی اور دلیل کی ضرورت نہیں۔

اصل یہ ہے کہ اسلام کا انحصار اصلاً جس چیز پر ہے وہ دعوت ہے۔ دعوت اسلام کی سب سے بڑی قوت ہے جو ہمیشہ دوسری تمام قوتوں پر بالاثابت ہوتی ہے۔ اسلام کی پالیسی ہمیشہ یہ رہتی ہے کہ وہ اپنی اس بے خطا قوت کو استعمال کرے۔ اسلام میں صبر کی تاکید اسی لیے کی گئی ہے کہ مقابلہ کے میدان کو دعوت سے باہر نہ جانے دیا جائے۔ الّا یہ کہ فریق ثانی خود ہی اپنی کارروائیوں کی وجہ سے مجبور کر دے۔ اسلام دعوت کے میدان میں مقابلہ کرتا ہے نہ کہ جنگ کے میدان میں۔

باب دوم :

عملِ دعوت

دعوتی عمل

یہ بات تمام مسلمانوں کے نزدیک متفق علیہ ہے کہ اسلام کا دعوتی عمل جاری رہنا ضروری ہے تاکہ اس کا پیغام ہر دور میں تمام نسلوں تک پہنچ سکے۔ یہ کام کیسے ہو۔ موجودہ زمانہ میں اس کے بارہ میں مختلف نقطۂ نظر ہو گئے ہیں۔ ایک گروہ کے نزدیک اس کا طریقہ یہ ہے کہ اسلام ایک مکمل نظام کے طور پر قائم و نافذ کیا جائے تاکہ لوگ اس کی برکتوں کا عملی تجربہ کریں۔ اس طرح وہ اسلام کے کمالات کے قائل ہو کر اسلام میں داخل ہو جائیں گے۔ دوسرے گروہ کا ذہن یہ ہے کہ ہر ہر مسلمان کے اندر اسلامی عمل اور اسلامی کردار پیدا کیا جائے۔ جب دوسری قومیں مسلمانوں کو چلتے پھرتے دیکھیں گی تو وہ اپنے آپ اسلام قبول کر لیں گی۔

ان لوگوں نے اس پر غور نہیں کیا کہ اشاعت اسلام کا عمل تو پچھلے ہزار سال کے دوران مسلسل جاری تھا، وہ صرف بیسویں صدی میں پہنچ کر منقطع ہوا ہے۔ حالانکہ ابتدائی دور کے بعد پھر اس انداز کی دعوتی جدوجہد دوبارہ کبھی نہیں کی گئی۔ ایسی حالت میں اس کا سبب کیا تھا۔ اس پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اسلام اب ایک محمود اور مستحکم اور محفوظ دین ہے۔ اس کی یہ حیثیت عالمی سطح پر بالفعل قائم ہو چکی ہے۔ اس بنا پر اس کے پھیلنے کے لیے اب نہ براہ راست تبلیغ کی شرط ہے اور نہ عملی نظام کی موجودگی یا اصلاح یافتہ مسلمانوں کی نمائندگی ضروری ہے۔ اب وہ اپنے آپ لوگوں کو متاثر کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے، شرط صرف یہ ہے کہ اسلام اور دوسری قوموں کے درمیان نفرت کی فضا نہ پائی جائے۔

قدیم زمانہ میں کبھی نفرت کی فضا موجود نہ تھی۔ چنانچہ قدیم زمانہ میں مسلسل اسلام کی اشاعت کا عمل جاری رہا۔ موجودہ زمانہ میں نااہل لیڈروں نے ساری دنیا میں یہ کیا کہ انھوں نے اسلام کے نام پر ٹکراؤ کی سیاست چلائی اور جدید میڈیا نے اس کو خوب مشتہر کیا۔ اس کے نتیجہ میں تاریخ میں پہلی بار اسلام اور دوسری قوموں کے درمیان نفرت کی فضا قائم ہو گئی۔ یہی نفرت کی فضا اسلام کے اشاعتی عمل کو جاری رکھنے میں رکاوٹ بن گئی۔

اسلام کے نام پر ٹکراؤ اور احتجاج کی سیاست نے موجودہ زمانہ میں اسلام کی اشاعت کے عمل کو روک دیا ہے۔ اب ضرورت صرف یہ ہے کہ اس لایعنی سیاست کو ترک کر دیا جائے۔ اس کے بعد اسلامی دعوت کا عمل اپنے آپ جاری ہو جائے گا، جیسا کہ وہ ماضی میں مسلسل اپنے آپ ہر جگہ جاری تھا۔

تعمیری لاوا

زمین کے اوپر جس طرح ندیاں بہتی ہیں، اسی طرح زمین کے اندر لاوا (Lava) بہتا ہے۔ لاوا پگھلی ہوئی چٹانیں ہیں۔ ان کا درجہ حرارت ایک ہزار ڈگری یا اس سے کچھ کم یا زیادہ ہوتا ہے۔ یہ لاوا اپنی نالیوں (Vulcano) کے راستہ سے بہتا ہوا کبھی کبھی زمین کے اوپر آجاتا ہے۔ اس وقت ہم کہتے ہیں کہ فلاں مقام پر جوالامکھی پھٹ پڑا۔

انسانی آبادیوں کا معاملہ بھی ایسا ہی ہے۔ مثلاً ۹۰-۱۹۸۹ میں کشمیر میں گولی اور بم کا ایک طوفان جاری ہوگیا۔ یہ بھی ایک انسانی لاوا تھا۔ کشمیر کے لوگ ۱۹۴۷ کے بعد سے احساس محرومی کا شکار ہو رہے تھے۔ اس کے نتیجہ میں ان کے اندر شکایتوں کا لاوا پک رہا تھا جو آخر کار پھٹ پڑا۔

یہ تخریبی لاوا کی مثال تھی۔ اسی طرح ایک اور لاوا ہے جس کو "تعمیری لاوا" کہہ سکتے ہیں۔ پہلا لاوا تخریب کی نفسیات سے ابھرتا ہے اور دوسرا لاوا تعمیر کی نفسیات سے۔

ایک قوم کے اندر تعمیر ذہن کی تحریک چلائی جائے۔ اس کے اندر ایمان کا جذبہ بیدار کیا جائے اس کے افراد میں اخلاق و کردار پیدا کیا جائے۔ اس کو ایک ایسی قوم بنایا جائے جس کے افراد باشعور افراد ہوں۔ یہ کام اگرچہ بظاہر ایک خاموش اور دیر طلب کام ہے، مگر وہ لاوا بننے کے عمل سے کم نہیں۔ جب وہ اپنی آخری حد پر پہونچتا ہے تو وہ تعمیری لاوا بن کر پھوٹ پڑتا ہے۔ وہ پورے ماحول میں نیا انقلاب برپا کر دیتا ہے۔

تخریبی لاوا اور تعمیری لاوا دونوں کے نمونے دنیا میں دیکھے جا سکتے ہیں۔ تخریبی لاوا کی ایک مثال بم ہے اور تعمیری لاوا کی ایک مثال درخت۔

بم پھٹتا ہے تو کیا ہوتا ہے۔ وہ اپنے چاروں طرف تکلیف دہ شور بکھیرتا ہے۔ وہ اپنے آس پاس کی دنیا میں ہر چیز کو برباد کر دیتا ہے۔ بم کا پھٹنا تخریبی لاوا کا پھٹنا ہے۔ جتنا بڑا بم اتنی ہی زیادہ بربادی اور تخریب کاری۔

اس کے بعد درخت کی مثال دیکھئے۔ درخت کا لاوا اس کے بیج کے اندر ہوتا ہے۔ درخت کا ایک بیج جب زمین میں ڈالا جاتا ہے تو وہ بھی پھٹتا ہے۔ مگر بیج کے پھٹنے سے کوئی شور برپا

نہیں ہوتا۔ بیج کا پھٹنا مکمل طور پر ایک خاموش انفجار ہوتا ہے۔

پھر یہ کہ بیج جب پھٹتا ہے تو وہ اپنے اندر سے بربادی نہیں نکالتا بلکہ آبادی نکالتا ہے۔ بیج کا پھٹنا ایک سرسبز و شاداب درخت کا ظہور میں آنا ہے جس کو دیکھ کر لوگوں کی آنکھیں ٹھنڈی ہوں۔ جس کے نیچے لوگوں کو سایہ ملے۔ جس سے پھول کی خوشبو اور پھل کی خوراک حاصل ہو۔

عام انسانی تحریکیں تخریبی انفجار کے ہم معنی ہیں۔ یہ تحریکیں جب پھٹتی ہیں تو لوگوں کو گولی اور بم کا شور سننا پڑتا ہے۔ وہ اپنے ساتھ تباہی اور بربادی کے واقعات لے آتی ہیں۔ پوری انسانی آبادی ان کے نتائج کو دیکھ کر چیخ اٹھتی ہے۔

مگر ایک سچی اسلامی تحریک کا معاملہ اس سے بالکل مختلف ہے۔ سچی اسلامی تحریک درخت کے بیج کی مانند ہے۔ اس کا انفجار خاموش انفجار ہوتا ہے۔ سچی اسلامی تحریک سے جو افراد تیار ہوتے ہیں، ان میں کا ہر شخص خدا کا شاداب درخت ہوتا ہے۔ اس قسم کے انسانی گروہ کا پھٹنا خدا کی زمین میں ایک لہلہاتا ہوا باغ وجود میں لانا ہے۔

ایسے لوگ انسانوں کے لیے سراپا رحمت بن کر ابھرتے ہیں۔ وہ سہتے ہیں تاکہ دوسروں کو نہ سہنا پڑے۔ وہ جاگتے ہیں تاکہ دوسرے لوگ سوئیں۔ وہ اپنے آپ کو محروم کرتے ہیں تاکہ دوسرے لوگ پائیں۔ وہ جھک جاتے ہیں تاکہ دوسروں کو کھڑا ہونے کا موقع ملے۔ وہ کم پر راضی ہو جاتے ہیں تاکہ دوسروں کو زیادہ ملے۔ وہ موت کو قبول کرتے ہیں تاکہ دوسروں کو زندگی حاصل ہو۔ وہ اپنے سینہ کو غم کا قبرستان بناتے ہیں تاکہ دوسروں کے گھروں میں خوشیوں کی بہار آسکے۔

تاریخ میں تخریبی لاوا پھٹنے کی بے شمار مثالیں ہیں، ماضی میں بھی اور حال میں بھی۔ مگر تعمیری لاوا پھٹنے کی کامل مثال معلوم تاریخ میں صرف ایک ہے، اور وہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کے اصحاب کی مثال ہے۔

ساتویں صدی عیسوی میں صحابہ کرام کا اٹھنا اسی قسم کے ایک تعمیری لاوے کا پھٹنا تھا جس کو قرآن میں خیرامت کا اخراج (آل عمران ۱۱۰) سے تعبیر کیا گیا ہے۔ انسانوں کے درمیان جب تخریبی لاوا پھٹتا ہے تو وہ ہر طرف تخریب بکھیرتا ہے۔ مگر تعمیری لاوا جب پھٹتا ہے تو وہ ہر طرف تعمیر کا چمن اگا دیتا ہے۔ صحابہ کرام کی صورت میں تعمیر کا جو لاوا پھٹا اس نے ساری دنیا کو اسی قسم کے تعمیری نتائج سے بھر دیا۔

اسلام کی پکار

اسلام کی تاریخ میں مکہ کا ۱۳ سالہ دور دعوتی محنت (dawa activism) کا دور ہے۔ اور اس کے بعد کا ہزار سالہ دور دعوتی عمل (dawa process) کا دور۔ ابتدائی ۱۳ سالہ دور میں پیغمبرؑ اور آپ کے اصحاب نے جو دعوتی محنت کی اس ڈھنگ کی دعوتی محنت، معلوم تاریخ کے مطابق اسلام میں دوبارہ نہیں ہوئی۔ اس کے باوجود اسلام کی اشاعت اور توسیع مسلسل جاری رہی۔ اسی کے نتیجہ میں ہم دیکھتے ہیں کہ آج مسلمان دنیا بھر کے تمام ملکوں میں قابل لحاظ تعداد میں موجود ہیں۔

اس کی وجہ یہ ہے کہ ابتدائی ۱۳ سالہ محنت اتنی عظیم اور ہمہ گیر تھی کہ اس کے اثرات بعد کی انسانی تاریخ میں بطور عمل (process) جاری ہو گئے۔ مکہ کے انداز کی براہ راست دعوتی محنت کے بغیر اسلام خود اپنی طاقت سے انسانی آبادیوں میں مسلسل پھیلتا رہا۔

اس اشاعتی عمل میں اگر کبھی وقتی رکاوٹ پڑی تو صرف اس وقت پڑی جب کہ مسلمان اور غیر مسلمان (داعی اور مدعو) میں کوئی نزاع یا ٹکراؤ پیش آیا اور اس کی بنا پر دونوں کے درمیان نفرت اور تلخی کی فضا پیدا ہو گئی۔ مثلاً صلیبی جنگوں کے نتیجہ میں یورپ کی مسیحی قوموں میں اسلام اور مسلمانوں کے خلاف نفرت پیدا ہونا۔ یا ایشیائی ملکوں میں نو آبادیاتی نظام کے سبب سے مسلمانوں اور غیر مسلموں کے درمیان تلخی اور کشیدگی کا ماحول بن جانا۔ یا ہندستان میں دو قومی سیاست کے نتیجہ میں ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان دوری پیدا ہو جانا۔

یہ تجربہ بتاتا ہے کہ مذکورہ دعوتی عمل خود اپنی طاقت سے تاریخ میں جاری ہے۔ وہ اگر کبھی رکتا ہے تو صرف ایک سبب سے رکتا ہے، اور وہ ہے ــــــ داعی اور مدعو کے درمیان معتدل تعلقات کا ختم ہو جانا۔

ایشیائی نسبت سے اس معاملہ کا مطالعہ کرتے ہوئے معلوم ہوتا ہے کہ انیسویں صدی میں غیر مسلم قومیں جدید قوتوں سے مسلح ہو کر مسلم قوموں پر غالب آ گئیں۔ اس واقعہ کو مسلمانوں نے اپنے لئے قومی ذلت سمجھا اور ساری دنیا میں وہ غیر مسلم قوموں سے لسانی یا عملی جنگ میں مشغول

ہو گئے۔ اس ٹکراؤ میں واضح اسباب کی بنا پر مسلمانوں کو کامیابی حاصل نہ ہو سکی۔ اس طرح انھیں دوبارہ غلبہ کا مقام تو نہیں ملا، البتہ مسلمانوں اور غیر مسلموں کے درمیان نفرت کا پہاڑ کھڑا ہو گیا۔

قدیم زمانہ میں بھی مسلمانوں اور غیر مسلموں کے درمیان لڑائیاں ہوتی تھیں۔ مگر اس زمانہ میں وہ چیز موجود نہ تھی جس کو میڈیا کہا جاتا ہے۔ اس لئے قدیم جنگوں کے اثرات صرف میدان جنگ تک محدود ہو کر رہ جاتے تھے۔ موجودہ زمانہ میں میڈیا نے اس کو عالمی خبر کی حیثیت دیکر ایک ایک شخص تک اسے پہنچا دیا۔

اب ضرورت ہے کہ پورے معاملے پر ازسرنو غور کیا جائے۔ اور ان حالات کو پھر سے تاریخ میں واپس لایا جائے جس میں دعوت کا عمل دوبارہ جاری ہو سکے۔ اس کی صورت صرف ایک ہے۔ اور وہ یہ کہ مسلمان یک طرفہ صبر کا طریقہ اختیار کریں۔

مسلمانوں اور غیر مسلموں، بالفاظ دیگر داعی اور مدعو کے درمیان جو نفرت اور کشیدگی پیدا ہو گئی ہے وہ اتنی گہری ہے کہ اب اس کو صرف یک طرفہ کارروائی ہی کے ذریعہ روکا جا سکتا ہے۔ نفرت کی یہ فضا کبھی بھی دو طرفہ بنیاد پر ختم نہیں ہو سکتی۔ ایسی حالت میں مسلمانوں ہی کو یہ کرنا ہے کہ وہ یکطرفہ عمل کے ذریعہ اس کے خاتمے کو یقینی بنا دیں، تاکہ دعوت کا عمل دوبارہ نارمل حالت میں جاری ہو جائے جس طرح وہ پہلے ساری دنیا میں جاری تھا۔

مسلمانوں اور غیر مسلموں (داعی اور مدعو) کے درمیان نارمل تعلقات انتہائی طور پر ضروری ہیں۔ نارمل فضا میں ہی یہ ممکن ہے کہ ایک شخص دوسرے کے نقطۂ نظر پر غور کرے۔ یہ ایک ایسی فطری حقیقت ہے جس کی مثالیں ہر طرف بہ آسانی دیکھی جا سکتی ہیں۔ اس معاملہ کو سمجھنے کے لئے حال کی ایک سادہ مثال لیجئے۔

۱۳ مئی ۱۹۹۴ کو دہلی میں میری ملاقات ایک مسلم نوجوان مسٹر منصور سے ہوئی۔ وہ دہلی کے ایک اسکول (ایئر فورس بال بھارتی) میں پڑھتے ہیں۔ اس وقت وہ بارھویں درجہ کے طالب علم ہیں۔ انھوں نے بتایا کہ ہمارے اسکول میں جب دو طالب علم آپس میں ملتے ہیں تو امریکی طریقہ کے مطابق وہ ایک دوسرے کو ہائے (Hi) کہتے ہیں۔ مگر ہم چند مسلمان طالب علم جب آپس میں ملتے ہیں تو ہم ایک دوسرے کو السلام علیکم کہتے ہیں۔ غیر مسلم طلبہ نے جب اس کو سنا تو انھوں نے پوچھا

کہ یہ تم آپس میں کیا کہتے ہو۔ انھوں نے بتایا کہ یہ عربی کلمہ ہے۔ اور اس کا مطلب یہ ہے کہ تمہارے اوپر سلامتی ہو:

May peace be upon you.

غیر مسلم طلبہ نے اس کو بہت پسند کیا اور کہا کہ گریٹنگ کا یہ کتنا اچھا طریقہ ہے۔ اس کے بعد وہ خود بھی السلام علیکم کہنے لگے۔ حتی کہ بعض طلبہ اتنا متاثر ہوئے کہ کہا کہ ہم تمہارے ساتھ نماز پڑھیں گے۔ چنانچہ ایک غیر مسلم نوجوان نے خاص طور پر درزی سے اپنے لئے مسلم لباس (شلوار اور قمیص اور ٹوپی) سلوایا اور اس کو پہن کر مسٹر منصور کے ساتھ مسجد میں گیا اور عید کی نماز ادا کی۔ اسی طرح ایک طالب علم نے رمضان کے مہینہ میں ایک روزہ رکھا۔ کئی غیر مسلم طلبہ آپس میں کہنے لگے کہ جھٹکا مت کھاؤ، حلال میٹ کھاؤ، وہ زیادہ اچھا ہوتا ہے۔ وغیرہ۔

مذکورہ اسکول میں چند مسلمان ہیں۔ باقی سب کے سب غیر مسلم ہیں۔ یہاں بالکل لبرل ماحول ہے۔ مسلم اور غیر مسلم کشیدگی سے اس کا ماحول یکسر خالی ہے۔ اس فضا کی بنا پر یہاں مسلم طلبہ اور غیر مسلم طلبہ کی ملاقات بالکل فطری ماحول میں ہوتی ہے۔ ان کے درمیان دوری اور توحش کی دیوار حائل نہیں ہوتی۔ اس کا قدرتی نتیجہ وہ تاثر ہے جس کی مثال اوپر نقل کی گئی۔

معتدل ماحول میں یہ اختلاط (interaction) جو مذکورہ اسکول میں جزئی طور پر پایا جاتا ہے، یہی ماحول اگر پورے ملک میں اور ساری دنیا میں کلی طور پر پیدا ہو جائے تو اپنے آپ اسلام کی اشاعت ہونے لگے۔ اسلام چونکہ غیر محرف مذہب ہے اور دوسرے مذاہب سب کے سب محرف مذہب، اس لئے محض سادہ تقابل ہی لوگوں کو اسلام کی طرف مائل کرنے کا ذریعہ بن جاتا ہے۔ شرط صرف یہ ہے کہ یہ تقابل معتدل فضا میں پیش آیا ہو۔

دو آیتیں

قرآن میں حکم دیا گیا ہے کہ کافروں اور منافقوں کی طرف سے تم کو جو اذیت پہنچتی ہے، اس کو نظر انداز کرو (الاحزاب ۴۸) نبیوں پر ان کے مخاطبین نے تکلیفیں ڈالیں تو نبیوں نے ان سے کہا کہ تم ہم کو جو اذیت دے رہے ہو، اس پر ہم صبر کریں گے۔ (ابراہیم ۱۲)

ایک طرف قرآن میں زیادتیوں کے مقابلہ میں صبر و اعراض کا یہ حکم ہے۔ دوسری طرف اسی قرآن میں کہا گیا کہ اہل ایمان کو اجازت دی جاتی ہے کہ وہ ظلم کرنے والوں کے ساتھ جنگ کریں (الحج ۳۹)، ان لوگوں سے اللہ کے راستہ میں جنگ کرو جو تم سے جنگ کرتے ہیں (البقرہ ۱۹۰)

یہ دونوں حکم بظاہر ایک دوسرے سے بالکل مختلف ہیں۔ پھر ان میں تطبیق کیا ہے۔ ان میں تطبیق یہ ہے کہ دونوں کا محل الگ الگ ہے۔ پہلا حکم ایک موقع کے لئے ہے اور دوسرا حکم دوسرے موقع کے لئے۔

اصل یہ ہے کہ مسلمان کی حیثیت ایک داعی گروہ کی ہے۔ اور دوسرے تمام لوگ ان کے لئے مدعو کی حیثیت رکھتے ہیں۔ مسلم اور غیر مسلم کے درمیان اصل نسبت یہی داعی اور مدعو کی نسبت ہے۔ اس نسبت کا تقاضا ہے کہ داعی اپنے مدعو کی زیادتیوں پر یک طرفہ صبر کرے۔ اس صبر و اعراض کے بغیر داعی اور مدعو کے درمیان وہ معتدل فضا قائم نہیں ہو سکتی جو کسی نئے پیغام کو سننے اور اس کی طرف انھیں متوجہ کرنے کے لئے ضروری ہے۔

غیر مسلم قوموں کے مقابلہ میں اہل اسلام کو مستقل طور پر اسی پالیسی پر قائم ہونا ہے۔ انھیں غیر مسلموں کے برے سلوک کو نظر انداز کرتے ہوئے ان کے ساتھ اچھا سلوک کرنا ہے۔ دعوت کے مرحلہ میں اس کے سوا کوئی دوسرا رویہ مسلمانوں کے لئے جائز نہیں۔

البتہ جب دعوت کا مرحلہ پورا ہو جائے اور غیر مسلم قوم کی طرف سے جارحانہ کارروائی کا آغاز کر دیا جائے تو اس وقت دفاع کے طور پر جنگ کی جا سکتی ہے۔ قرآن میں جنگ کی آیتیں اسی آخری صورت حال سے تعلق رکھتی ہیں۔

جنگ کا عمل اس وقت شروع ہوتا ہے جب کہ دعوت کا عمل اپنی آخری حد پر پہنچ چکا ہو۔ تکمیل دعوت سے پہلے جنگ چھیڑنا مسلمان کے لئے جائز نہیں۔

دعوت الی اللہ

مسلمان ختم نبوت کے بعد مقام نبوت پر ہیں۔ مسلمانوں کو پیغمبر کی نیابت میں وہی کام انجام دینا ہے جو پیغمبر نے اپنی زندگی میں براہ راست انجام دیا تھا (لیکون الرسول شهيداً عليكم وتكونوا شهداء على الناس)

یہ کام شہادت علی الناس اور دعوت الی اللہ ہے۔ اس سے مراد نہ حکومت اسلامی کا قیام ہے اور نہ حضارت اسلامی کا احیاء۔ اس کا مقصد تمام تر انذار و تبشیر ہے۔ اس کا نشانہ یہ ہے کہ خدا کے بندوں تک خدا کا پیغام اس حد تک پہنچ جائے کہ کسی کے لئے قیامت کے دن کوئی عذر باقی نہ رہے (رسلاً مبشرين ومنذرين لئلا يكون للناس على الله حجة بعد الرسل)

اسلام میں حکومت اور اقتدار کی حیثیت شیٔ آخر کی ہے۔ وہ امر مقصود نہیں ہے بلکہ وہ ایک امر موعود ہے (وعد الله الذين آمنوا وعملوا الصالحات ليستخلفنهم في الارض) اہل ایمان کو اجر آخرت کے محرک کے تحت دعوت الی اللہ کا کام کرنا ہے۔ البتہ یہ اللہ تعالیٰ کا وعدہ ہے کہ وہ اس عمل کے دوران ایسے حالات پیدا کر دے گا جو اہل ایمان کو دنیوی غلبہ تک پہنچانے والے ہوں۔

اللہ کی نصرت کے تمام وعدے عمل دعوت کی انجام دہی پر موقوف ہیں۔ اسی میں ملت اسلامیہ کی فوز و فلاح ہے۔ اسی میں عصمت من الناس کا راز چھپا ہوا ہے۔ حتی کہ امت محمدی کا امت محمدی ہونا عند اللہ اسی وقت متحقق ہوتا ہے جبکہ وہ دعوت الی اللہ کے اس کام کو انجام دے (المائدہ ٦٧)

اس کام کی صحیح ادائگی کے لئے ضروری ہے کہ مسلمانوں اور دیگر اقوام کے درمیان داعی اور مدعو کا رشتہ قائم کیا جائے۔ یہ رشتہ قائم کرنے کی ایک بھاری قیمت دینی لازمی ہے۔ وہ یہ کہ مسلمان مدعو قوموں کی زیادتیوں اور ایذا پر یک طرفہ صبر کریں۔ اس کے بغیر مسلمانوں اور غیر مسلموں کے درمیان داعی اور مدعو کا رشتہ قائم نہیں ہو سکتا (ولنصبرن على ما آذيتمونا)

مسلمانوں کے جو قومی مسائل ہیں ان کے لئے کچھ لوگ علٰحدہ پلیٹ فارم بنا سکتے ہیں مگر اس طرح

کے امور کو دعوت کا عنوان دینا دعوت کی نفی کرنا ہے۔ ان مسائل کا حقیقی حل یہ نہیں ہے کہ ان کو دعوت کی فہرست میں شامل کر دیا جائے۔ اس کے بجائے ہم کو یہ یقین و اعتماد پیدا کرنا ہوگا کہ اگر ہم دعوت کا کام انجام دے دیں تو اس کے بعد ہمارے مسائل بھی لازمی طور پر حل ہو جائیں گے۔

مسلم ملکوں میں قانون اسلامی کے نفاذ یا غیر اسلامی حکمرانوں کے اخراج کے نام پر اسلامی جماعتوں اور قائم شدہ حکومت کے درمیان جو نزاع جاری ہے اس کو مکمل طور پر ختم کرنا ضروری ہے۔ اس جنگ کے نتیجہ میں اسلامی تحریک غیر ضروری طور پر مسلم حکمرانوں کی حریف بن گئی ہے اور مسلم حکومتوں کا وہ تعاون اسلامی دعوت کے عمل کے لئے نہیں مل رہا ہے جو معتدل حالات میں ملنا یقینی تھا۔ مسلم ملکوں کے لئے صحیح اسلامی طریق کار یہ ہے کہ مسلم حکمرانوں سے سیاسی ٹکراؤ نہ کرتے ہوئے ممکن مواقع کو دعوتی مقاصد کے لئے استعمال کیا جائے۔

ضروری دعوتی پروگرام

۱ قرآن و حدیث اور سیرت کے ترجمے تمام زبانوں میں شائع کر کے عالمی سطح پر پھیلانا۔ یہ ترجمے صحیح اور معیاری زبان میں ہوں۔

۲ جدید عصری اسلوب میں اسلامی لٹریچر ہر زبان میں تیار کرنا اور ان کو وسیع پیمانہ پر پھیلانا۔ اس لٹریچر کو مثبت اور موضوعی انداز میں ہونا چاہئے۔

۳ ایسے اجتماعات منعقد کرنا جن میں غیر مسلموں کو بھی شریک کیا گیا ہو۔ ان اجتماعات میں صرف دعوتی کلام کیا جائے۔ اقوام عالم کی عداوتوں اور سازشوں پر شکایات و احتجاج سے آخری حد تک پرہیز کیا جائے۔

۴ ایسے ادارے کا قیام جہاں مسلم نوجوانوں کو دعوتی انداز میں تربیت دی جائے اور ان کو داعی کی حیثیت سے زندہ رہنے کے لئے تیار کیا جائے۔

۵ دعوتی میدان میں کام کرنے والوں کا سالانہ یا اس سے کم مدت میں اجتماع کیا جائے تاکہ ایک کے مشورہ اور تجربہ سے دوسرے کو فائدہ پہنچ سکے۔

۶ مسلمانوں میں دعوتی ذہن اور تعمیری طرز فکر پیدا کرنے کے لئے مستقل جرائد مختلف زبانوں میں جاری کرنا۔ ان جرائد کو موثر بنانے کے لئے ضروری ہے کہ ان کو ہر قسم کے غیر دعوتی مباحث سے یکسر پاک رکھا جائے۔

داعی کا معاملہ

ایک فن کار اپنی ساری صلاحیت استعمال کر کے آرٹ کا ایک نمونہ تخلیق کرے اور ایک شخص اس کو لے کر آگ میں ڈال دے تو ایسا شخص فن کار کی نظر میں کتنا زیادہ مبغوض ہوگا۔ فن کار کی نظر میں اس کا وجود انتہائی حد تک قابل نفرت ہو جائے گا۔

ایک باغبان برسوں کی محنت سے پھول کا ایک درخت اگائے۔ پھر لمبے انتظار کے بعد اس کی شاخ پر ایک حسین پھول کھلے۔ اس وقت اگر ایک شخص آئے اور اس پھول کو توڑ کر اسے مسل ڈالے تو اس باغبان کی نظر میں وہ سخت ترین مجرم ہوگا۔ باغبان چاہے گا کہ اس کو بھی وہ اسی طرح مسل ڈالے جس طرح اس نے اس کے حسین پھول کو مسلا ہے۔

خدا کے داعی کا معاملہ بھی یہی ہے۔ خدا کا داعی اگرچہ بظاہر ایک انسان ہوتا ہے۔ مگر وہ اپنی حقیقت کے اعتبار سے کائنات کی سب سے قیمتی متاع ہے۔ زمین و آسمان بے شمار گردشیں کرتے ہیں تب قدرت کا وہ قیمتی آرٹ ظہور میں آتا ہے جس کو خدا کا داعی کہتے ہیں۔ سیکڑوں سال کے اندر بے شمار اسباب جمع ہوتے ہیں تب خدا کی زمین پر معنویت کا وہ پھول کھلتا ہے جس کا دوسرا نام خدا کا داعی ہے۔

ایسی حالت میں جو لوگ خدا کے داعی کے خلاف تخریب کاری کے منصوبے بنائیں وہ پوری کائنات کی ناقدری کرتے ہیں۔ وہ خدا کے خلاف سب سے زیادہ سنگین بغاوت کرتے ہیں۔ وہ اس پھول کو مسلنے کی کوشش کرتے ہیں جس کو خدا نے خود اگایا ہے۔

خدا کی ضمانت ہے کہ ایسے لوگ اپنے منصوبہ میں کبھی کامیاب نہیں ہو سکتے۔ ان کے لیے ناممکن ہے کہ وہ خدا کے داعی کو اس کے مشن کی تکمیل سے باز رکھ سکیں۔ خدا کا سچا داعی خدا کی خاص حفاظت کے سایہ میں رہتا ہے۔ اس کے لیے خدا کا ابدی فیصلہ ہے کہ وہ لازمی طور پر کامیاب ہو، اور اس کے دشمن لازمی طور پر ناکام و نامراد ہو کر رہ جائیں۔

خدا کے داعی کو زیر کرنا ایسا ہی ہے جیسے خدا کو زیر کرنا، اور کون ہے جو خدا کو زیر کرنے کی طاقت رکھتا ہو (۱۷ جنوری ۱۹۸۶)

پیغمبر کی پیشین گوئی

عن مرداس الاسلمی قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یذہب الصالحون الاول فالاول وتبقی حثالۃ کحثالۃ الشعیر او التمر لا یبالیہم اللہ بالۃ (رواہ البخاری)

مرداس اسلمی سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ صالح لوگ چلے جائیں گے، ایک کے بعد ایک۔ اور پھر بھس رہ جائے گا، جیسے جَو یا کھجور کا بھس ہوتا ہے۔ اللہ کو ان کی کچھ پروا نہ ہوگی۔

اس حدیث میں ذہَاب کا مطلب موت نہیں ہے۔ یعنی اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ امت کے صالح افراد مرجائیں گے اور غیر صالح افراد زندہ رکھے جائیں گے۔ کیوں کہ موت تو سب کے اوپر یکساں طور پر آتی ہے۔ وہ صالح اور غیر صالح کے درمیان فرق نہیں کرتی۔

اس حدیث میں دراصل یہ بتایا گیا ہے کہ بعد کے زمانہ میں اسلامی اداروں اور اسلامی حلقوں کا یہ حال ہوجائے گا کہ وہاں عمومی طور پر وہ لوگ جمع ہوں گے جو پست ذوق اور معمولی صلاحیت والے ہیں۔ بلند صلاحیت والے اور اعلیٰ ذوق کے لوگ دینی شعبوں میں آنا کم ہوجائیں گے۔

خدا کا دین ایک ہی دین ہے۔ مگر نمائندگی کے اعتبار سے اس میں فرق ہوجاتا ہے۔ دین کی نمائندگی جب اعلیٰ سطح پر ہو تو اعلیٰ درجہ کے افراد اس کی طرف کھنچتے ہیں۔ اور جب دین کی نمائندگی پست سطح پر ہونے لگے تو پست درجہ کے لوگ ہی اس کی طرف آتے ہیں۔

اداروں اور تحریکوں میں اگر اعلیٰ معیار کی تقریر اور تحریر کے ذریعہ دین کو پیش کیا جارہا ہو تو اعلیٰ سطح کے افراد اس کی طرف کھنچیں گے۔ ان سے جس کردار کا مظاہرہ ہوگا وہ بھی اعلیٰ اور ارفع کردار ہوگا۔ اور جب دین پیش کرنے والوں کے یہاں تقریر و تحریر اور اخلاق و کردار کا معیار پست ہوجائے تو اسی درجہ کے لوگ دینی حلقوں میں جمع ہوں گے جو دین کی نمائندگی کرنے والوں کا درجہ ہے۔

"اللہ کو ان کی پروا نہ ہوگی" کا مطلب یہ ہے کہ ایسے لوگوں کے ذریعہ دین کا کوئی بڑا کام نہیں انجام پاسکتا۔ بڑا کام کرنے کے لیے بڑا دل اور اعلیٰ صلاحیت درکار ہوتی ہے۔ اور یہ چیزیں ان کے یہاں موجود نہ ہوں گی۔ ایسی حالت میں اس قسم کے لوگ کوئی بڑا دینی کام کس طرح انجام دے سکتے ہیں۔

دعوت کا میدان

دوسری جنگ عظیم میں جرمنی اور جاپان ایک فوجی اتحاد میں شامل تھے جس کو محوری طاقتیں (Axis Powers) کہا جاتا تھا۔ ۱۹۴۰ میں اس اتحاد کا نعرہ تھا ——— آج یورپ، کل دنیا:

Today Europe, tomorrow the world

اس مقصد کے لئے جرمنی اور جاپان نے وہ خوفناک جنگ چھیڑی جس کو دوسری جنگ عظیم کہا جاتا ہے۔ مگر ہم جانتے ہیں کہ فوجی طاقت کے ذریعہ دنیا پر اپنی بالا دستی قائم کرنے کا یہ منصوبہ سراسر ناکام رہا۔ تاہم جنگ میں ناکامی نے جرمنی اور جاپان کو سبق دیا۔ انھوں نے اپنے فوجی منصوبہ کو ترک کرکے اپنی ساری توجہ صنعتی اور اقتصادی منصوبوں پر لگادی۔ طریق عمل کی اس تبدیلی کا شاندار نتیجہ برآمد ہوا۔ خاموش عمل نے ان ملکوں کو اقتصادی ترقی کے بلند ترین مقام پر پہنچا دیا۔ آج جرمنی اور خاص طور پر جاپان نے ساری دنیا میں صنعتی بالادستی کا مقام حاصل کرلیا ہے۔ دنیا کے بازار ان کی صنعتی پیداواروں سے پٹے ہوئے ہیں۔ اس واقعہ کا ذکر کرتے ہوئے لندن کا ایک ہفتہ وار میگزین "نیو سوسائٹی" (۵ فروری ۱۹۸۱) یہ معنی خیز جملہ لکھتا ہے کہ ان قوموں نے اپنے اس خواب کو امن سے پورا کرلیا جو ان کو ۴۰ سال پہلے جنگ کے میدان میں لے گیا تھا:

They have fulfilled in peace the visions
which took them to war 40 years ago.

جدید صنعتی قوموں کے اس واقعہ میں مسلمانوں کے لئے بہت بڑا سبق ہے۔ مسلمان پچھلے سو سال سے اپنے حریفوں کے مقابلہ میں سیاسی اور فوجی لڑائی چھیڑے ہوئے ہیں۔ ان لڑائیوں میں جان و مال کا اتنا زیادہ نقصان ہوا جس کا شمار نہیں کیا جاسکتا۔ تاہم بے پناہ قربانیوں کے باوجود ان کا کوئی فائدہ مسلمانوں کو نہیں ملا۔ اب وقت آگیا ہے کہ مسلمان اپنی جدید تاریخ پر نظر ثانی کریں اور اپنے طریق عمل کو بدل دیں۔ مسلمان کے پاس قرآن اور دین حق کی صورت میں اس سے زیادہ بڑی طاقت موجود ہے جس کو جرمنی اور جاپان نے سائنس اور ٹیکنالوجی کی صورت میں پایا ہے۔ مسلمان اگر سیاسی ہنگاموں اور فوجی مقابلہ آرائیوں کو چھوڑ دیں اور اپنی ساری قوت دیگر اقوام میں اسلام کی اشاعت پر لگائیں تو یقینی طور پر وہ اپنے ان حوصلوں کی تکمیل کرسکتے ہیں جن کی تکمیل میں وہ اب تک ناکام رہے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ مسلمان جس چیز کو "جنگ" کے میدان میں ناکام طور پر تلاش کر رہے ہیں وہ "دعوت" کے میدان میں کامیاب طور پر موجود ہے۔ بشرطیکہ وہ اس کو جانیں اور اس کو صحیح طور پر استعمال کریں۔

عبادت گاہ

ڈاکٹر رالف سسن Ralph R. Sisson اسٹیٹ یونیورسٹی آف نیویارک (امریکہ) میں کمیونی کیشن کے پروفیسر ہیں۔ ۲۷ جنوری ۱۹۸۹ کو ان سے اسلامی مرکز میں تفصیلی ملاقات ہوئی۔ اس ملاقات میں میں نے انھیں اسلام کے تصور توحید، تصور رسالت اور تصور آخرت سے متعارف کیا۔ گفت گو کے دوران میں نے ان سے پوچھا کہ آپ ایک عیسائی خاندان میں پیدا ہوئے۔ کیا آپ چرچ جاتے ہیں۔ انھوں نے کہا کہ پہلے جاتا تھا، مگر اب نہیں جاتا۔ اس کی وجہ بتاتے ہوئے انھوں نے کہا کہ چرچ کے اندر بڑا عجیب ماحول ہوتا ہے۔ نقش و نگار، موسیقی، مختلف آوازیں اور طرح طرح کے رسمی اعمال۔ مجھ کو تو چرچ عبادت گاہ کے بجائے ایک کلب جیسا معلوم ہوتا ہے:

It looks like a club, not a place of worship.

امریکی پروفیسر نے جو بات چرچ کے بارہ میں کہی، وہی تمام دوسرے مذاہب کی عبادت گاہوں کے لیے صحیح ہے۔ موجودہ زمانہ میں مذہبی بگاڑ نے تمام دوسرے مذاہب کی عبادت گاہوں کا ماحول ایسا بنا رکھا ہے کہ وہ عبادت گاہ کے بجائے کلب کے مشابہ ہو گئے ہیں۔ دوسرے مذاہب کی عبادت گاہوں کے مقابلہ میں اسلامی مسجد انتہائی سادہ ہوتی ہے۔ اسلامی مسجدیں واقعی عبادت گاہ نظر آتی ہیں۔ جب کہ دوسری عبادت گاہیں اپنے ظاہری حلیہ کے اعتبار سے کلب دکھائی دیتی ہیں۔ مساجد کی اس سادگی اور ان کے اندر فطری عبادت کے ماحول نے ان مساجد کو ایک قسم کی زندہ تبلیغ بنا دیا ہے۔ ان کو دیکھنا بذات خود اپنے اندر ایک تاثیری طاقت رکھتا ہے۔ مسجد اپنی ذات میں اسلام کی تبلیغ ہے۔

موجودہ زمانہ کے مسلمانوں میں دعوتی جذبہ نہ ہونے کا یہ نتیجہ ہے کہ انھوں نے اپنی مسجدوں کے دروازے غیر مسلموں کے اوپر بند کر رکھے ہیں۔ اگر کسی تاریخی مسجد میں سیاحوں کو داخلہ کی اجازت ہو تو وہاں بھی نماز کے وقت انھیں باہر کر دیا جاتا ہے۔ مسلمانوں کو چاہیے کہ وہ اپنی مسجدوں کے دروازے غیر مسلموں کے لیے آزادانہ طور پر کھول دیں۔ یہ واقعہ انشاءاللہ غیر مسلموں کے دل کے دروازے کھولنے کا ذریعہ بن جائے گا۔

نئے خون کی ضرورت

سید جمال الدین افغانی (۱۸۹۷ - ۱۸۳۸) مسلمانوں کی اصلاح سے مایوس تھے۔ امیر شکیب ارسلان نے اس بارہ میں ان کے جو خیالات نقل کئے ہیں، اس کا خلاصہ یہ ہے:

قد فسدت اخلاق المسلمین الی انه لا امل بان یصحوا الا بان ینشأوا خلقا جدیدا وجیلا مستأنفا فحبذا الو لم یبق منهم الا کل من هو دون الثانیة عشرة من العمر، فعند ذالك یتلقون تربیة جدیدة تسیر بهم فی طریق السلامة

مسلمانوں کے اخلاق اس حد تک بگڑ چکے ہیں کہ امید نہیں کہ ان کی اصلاح ہو۔ الا یہ کہ ان میں نئی نسل پیدا ہو۔ کیا ہی اچھا ہو کہ بارہ سال کی عمر کے سوا ان کے سارے لوگ ختم ہو جائیں۔ پھر وہ نئی تربیت قبول کریں گے جو انھیں سلامتی کے طریقہ تک پہنچائے۔

(حاضر العالم الاسلامی ۱۹۳۳، صفحہ ۲۹۰)

۲۳ دسمبر ۱۹۷۳ کو دہلی (جمعیۃ بلڈنگ) میں میری ملاقات مولانا سید منت اللہ رحمانی (امیر شریعت بہار) سے ہوئی۔ ان سے میں نے بعض مصلحین کے مذکورہ بالا تاثرات کا ذکر کیا۔ اس کے جواب میں انھوں نے ایک روایت بیان کی۔ یہ روایت میں نے اسی وقت ایک کاغذ پر خود ان کے اپنے قلم سے لکھوالی تھی۔ ان کے ہاتھ کا لکھا ہوا یہ کاغذ ابھی تک میرے پاس محفوظ ہے۔ اس میں مولانا رحمانی نے لکھا تھا:

"مولانا ابوالمحاسن محمد سجاد صاحب (۱۹۴۰ - ۱۸۸۳) نے مجھ سے کہا کہ ایک دفعہ مولانا محمد علی مونگیری (۱۹۲۷) کی خدمت میں عرض کیا کہ خدا بہتر جانتا ہے کہ جہاں جاتا ہوں اخلاص کے ساتھ جاتا ہوں، لیکن جب تک رہتا ہوں، لوگ دین کی طرف مائل رہتے ہیں، اور وہاں سے ہٹنے کے بعد لوگ بھی دین کو چھوڑ دیتے ہیں —— اخلاص کا تو اثر ہونا چاہئے۔ حضرت مونگیری نے جواب دیا کہ "اللہ تعالیٰ ہر عصر اور زمانہ میں اپنی کسی نہ کسی صفت کے ساتھ جلوہ گر رہتا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ خیر القرون میں اپنی صفت "الہادی" کے ساتھ جلوہ گر تھا، اور اس عہد میں اپنی صفت "المضل" کے ساتھ جلوہ گر ہے۔ اس لئے نہ ہدایت دیر پا ہوتی ہے اور نہ اخلاص موثر! جس کا نتیجہ یہ بھی ہے کہ جن لوگوں کا منصب ہدایت تھا، وہ گمراہ ہو رہے ہیں۔"

ڈاکٹر اقبال (۱۹۳۸ - ۱۸۷۷) کا مقصد یہ تھا کہ مسلمانوں کو صداقت اور عدالت اور شجاعت کا سبق پڑھائیں اور انھیں دوبارہ امامت دنیا کے لئے تیار کریں۔ انھوں نے مسلمانوں کو جگانے کے لئے اپنے اشعار کو رجز کے طور پر استعمال کیا۔ وہ اپنی ان کوششوں کے نتائج کے بارہ میں بہت پر امید تھے۔ چنانچہ انھوں نے کہا:

نہیں ہے ناامید اقبال اپنی کشت ویراں سے　　ذرا نم ہو تو یہ مٹی بہت زرخیز ہے ساقی

اقبال نے اپنی پوری زندگی اس مقصد کے لئے وقف کر دی۔ مگر ان کی "بانگ درا" اور "ضرب کلیم" کا کوئی نتیجہ نہ نکلا۔ یہاں تک کہ مسلمانوں کی استعداد کے بارہ میں وہ مایوس ہو گئے۔ انھوں نے آخری طور پر اپنا تجربہ ان الفاظ میں بیان کیا:

تیرے محیط میں کہیں گوہر زندگی نہیں　　ڈھونڈ چکا میں موج موج دیکھ چکا صدف صدف

یہی حال موجودہ زمانہ کے اکثر مصلحین کا ہوا ہے۔ ان میں سے ہر ایک نے مسلمانوں کو اپنی کوششوں کا مرکز بنایا۔ مگر ساری کوشش صرف کرنے کے بعد انھیں یہ تلخ احساس ہوا کہ مسلمانوں میں کوئی گہری اصلاح قبول کرنے کا مادہ ہی نہیں ہے۔

موجودہ مسلمانوں کی استعداد کے بارہ میں مذکورہ بالا اصحاب کا تجربہ بجائے خود صحیح ہے۔ مگر اس کی توجیہہ کے بارہ میں ان کا بیان صحیح نہیں۔ یہ درست ہے کہ گنتی اور مقدار دونوں اعتبار سے موجودہ زمانہ میں مسلمانوں کو اٹھانے کی بے حساب کوششیں کی گئیں مگر ان کا کوئی بھی قابل ذکر نتیجہ برآمد نہیں ہوا۔ مگر اس کی وجہ وہ نہیں جو اوپر نقل کئے ہوئے بیانات میں ملتی ہے۔

پانی اگر کسی گڑھے میں ٹھہر جائے تو کچھ دنوں کے بعد اس میں بدبو پیدا ہو جاتی ہے۔ مگر جو پانی چشمہ یا دریا کی صورت میں رواں ہو، وہ ہمیشہ تازہ اور فرحت بخش بنا رہتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ گڑھے کے پانی میں پرانے پانی کے ساتھ نیا پانی شامل ہونا بند ہو جاتا ہے۔ جب کہ چشمہ یا دریا میں مسلسل پرانے پانی میں نیا پانی آکر شامل ہوتا رہتا ہے۔

اسی مثال سے موجودہ زمانہ کے مسلمانوں کے معاملہ کو سمجھا جا سکتا ہے۔ موجودہ زمانہ کے مسلمان ایک جامد نسلی گروہ بن کر ٹھہرے ہوئے پانی کی مانند ہو گئے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان میں کثافت پیدا ہو گئی ہے۔ اب ضرورت ہے کہ ان کے اندر نیا خون (New blood) شامل کیا جائے۔ ان کے پرانے پانی

میں نیا پانی ملاکر انھیں رواں دریا بنا دیا جائے۔ اس کے بعد ان کی کثافت اپنے آپ ختم ہو جائےگی۔

دعوت کا عمل اسی مقصد کو پورا کرتا ہے۔ دعوت کے ذریعہ دوسری قوموں سے نئے اور جاندار افراد اسلام قبول کرکے مسلمانوں کی صف میں شامل ہوتے رہتے ہیں۔ اس طرح بار بار نئے خون کے ملنے سے مسلمانوں میں زندگی باقی رہتی ہے۔ مگر صدیوں سے مسلمانوں میں دعوتی عمل بند ہے۔ ان کے پرانے خون میں نیا خون آکر شامل نہیں ہو رہا ہے۔ یہی اصل وجہ ہے اس صورت حال کی جس کا ذکر اوپر چند اصحاب کے حوالے سے کیا گیا۔

دعوت الی اللہ کا کام مسلمانوں کے لئے بیک وقت دو فائدوں کا حامل ہے۔ ایک طرف وہ امت محمدی کی حیثیت سے اپنی عمومی ذمہ داریوں کو پورا کرنا ہے۔ اسی کے ساتھ یہی عمل اس بات کا ضامن بھی ہے کہ مسلمان ہمیشہ ایک زندہ اور طاقت ور قوم بنے رہیں۔

سیاست، دعوت

پاکستان کی ایک خاتون بیگم شائستہ اکرام اللہ (۷۵ سال) کا مضمون انگریزی ماہنامہ ریڈرس ڈائجسٹ کے شمارہ مئی ۱۹۹۱ میں چھپا ہے۔ وہ تقسیم سے پہلے آل انڈیا مسلم لیگ کی ایک سرگرم کارکن تھیں۔ تقسیم کے بعد ۱۹۴۷ سے ۱۹۵۴ تک وہ پاکستان کی دستور ساز اسمبلی کی ممبر رہیں۔ ۱۹۶۴ سے ۱۹۶۷ تک وہ مراکو میں پاکستان کی سفیر تھیں۔ مذکورہ مضمون کا عنوان ہے: "محمد علی جناح"۔ اس مضمون میں انھوں نے مسٹر محمد علی جناح کا ایک واقعہ نقل کیا ہے۔ یہ واقعہ بٹوارہ سے پہلے ۱۹۴۵ میں پیش آیا۔ وہ لکھتی ہیں:

I'd been invited by the government to represent India at an international peace conference in San Francisco, but the leader of our political party was telling me I shouldn't go. His reason: our party, the All-India Muslim League, was committed to non-cooperation with India's British rulers; as a disciplined Leaguer, I could not be part of a government delegation. I was tempted to go, so I said, "Can't I go and not talk politics?" "Then what will you talk about?" Mohammed Ali Jinnah asked sharply. "The man in the moon?" His face softened. "I know how disappointed you are," he said, "but a principle is at stake. One day, I promise, you will go to an international conference — and with honour, representing your country." That encounter took place in 1945, but even today the wonder of it moves me.

Reader's Digest, New Delhi, May 1991, pp. 29-30

برٹش گورنمنٹ کی طرف سے مجھے یہ دعوت دی گئی تھی کہ میں سان فرانسسکو میں ہونے والی ایک بین اقوامی امن کانفرنس میں ہندستان کی نمائندگی کروں۔ مگر ہماری سیاسی پارٹی کے قائد نے مجھ سے کہا کہ مجھ کو اس کانفرنس میں نہیں جانا چاہئے۔ ان کے نزدیک اس کی وجہ یہ تھی کہ ہماری پارٹی، آل انڈیا مسلم لیگ، اس کی پابند ہے کہ وہ ہندستان کے برٹش حکمرانوں سے تعاون نہیں کرے گی۔ لیگ کی ایک باضابطہ فرد کی حیثیت سے مجھ کو ایک سرکاری وفد کا حصہ نہیں بننا چاہئے۔ میں اس کانفرنس میں جانے کی طرف راغب تھی۔ اس لئے میں نے کہا کہ کیا ایسا نہیں ہوسکتا کہ میں جاؤں مگر وہاں میں سیاست کی بات نہ کروں۔ محمد علی جناح نے تیزی سے پوچھا کہ پھر اور کون سی بات تم وہاں کروگی۔ کیا چاند پر انسان کے بارہ میں۔ اس کے بعد انھوں نے نرمی کے ساتھ کہا کہ میں

جانتا ہوں کہ اس سے تم کو کتنی زیادہ مایوسی ہوگی۔ مگر یہاں ایک اصول خطرہ میں ہے۔ میں تم سے وعدہ کرتا ہوں کہ ایک دن تم ایک بین اقوامی کانفرنس میں جاؤگی اور عزت و وقار کے ساتھ اپنے ملک کی نمائندگی کروگی۔ مسٹر جناح کے ساتھ میرا یہ سامنا ۱۹۴۵ میں ہوا تھا، مگر آج بھی یہ واقعہ یاد آتا ہے تو میرے اوپر اس کا عجیب تاثر ہوتا ہے۔

مذکورہ بین اقوامی کانفرنس امن کے موضوع پر ہورہی تھی۔ یہاں موقع تھا کہ عالمی شخصیتوں کے سامنے اسلام کی امن سے متعلق تعلیمات پیش کی جائیں۔ اس عالمی اسٹیج کو اسلام کے تعمیری پیغام کے اعلان کے لئے استعمال کیا جائے۔ مگر مسٹر محمد علی جناح کے ذہن پر سیاست کا اتنا غلبہ تھا کہ انھیں اس کے سوا کوئی اور قابل ذکر بات معلوم ہی نہ تھی۔ ان کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ ایک عالمی کانفرنس میں اگر سیاست کی بات نہ کہنا ہو تو پھر اور کون سی بات ہے جو وہاں کہی جائے گی۔

تاہم یہ صرف مسٹر جناح کا معاملہ نہیں، یہی موجودہ زمانہ کے تمام مسلم قائدین کا معاملہ ہے۔ موجودہ زمانہ کے ہر مسلم قائد کا یہ حال ہوا کہ وہ سیاسی تحریک کے تحت اٹھا۔ اس کی پوری سوچ سیاسی رخ پر چل رہی تھی۔ اس لئے اس کو سیاست کے سوا کوئی اور کرنے کا کام معلوم ہی نہ تھا۔ ہر ایک بس سیاست کے میدان میں اپنی سرگرمیاں دکھاتا رہا۔ سیاست کے باہر اس کو کوئی کام نظر نہ آیا جس میں وہ اپنے کو یا اپنے ساتھیوں کو مصروف کرے۔

دور جدید کے انقلاب نے ہمارے لئے جو سب سے بڑا میدان کھولا وہ اسلامی دعوت کا میدان تھا۔ اس دور میں پہلی بار مذہب پر آزادانہ غور و فکر کی فضا پیدا ہوئی۔ جدید حالات نے اس کو ممکن بنایا کہ دوسرے مذاہب کے لوگ اپنے اہتمام میں مذہبی اور روحانی کانفرنس کریں، اور دوسرے مذاہب کے ساتھ اسلام کے نمائندوں کو بھی دعوت دیں کہ آپ وہاں آکر اسلام کی تعلیمات پیش کریں۔ جدید مواصلاتی ذرائع نے سفر کو اور پیغام رسانی کے عمل کو بے حد آسان بنادیا۔

مزید یہ کہ موجودہ زمانہ میں پہلی بار مذاہب کی آزادانہ تحقیق کی گئی۔ اس تحقیق نے خالص علمی اور تاریخی طور پر یہ ثابت کیا کہ تمام مذاہب غیر معتبر ہیں۔ مذاہب کی فہرست میں صرف اسلام ہی ایک ایسا مذہب ہے جو علمی طور پر ثابت شدہ اور تاریخی طور پر قابل اعتبار ہے۔

ایسی حالت میں مسلمانوں کو یہ کرنا تھا کہ وہ ہر دوسرے مسئلہ کو نظر انداز کرکے اسلام کے

پیغام رحمت کو تمام قوموں تک پہنچائیں۔ مگر مسلمانوں نے اس کے بالکل برعکس عمل کیا۔ انھوں نے اسلام کی پیغام رسانی کے کام کو مکمل طور پر نظر انداز کر دیا۔ اور نام نہاد سیاسی جہاد میں ہمہ تن مشغول ہو گئے۔ حتی کہ ان کا یہ حال ہوا کہ ان کے بڑے بڑے رہنماؤں تک کو شعور کے درجہ میں بھی اس کا احساس نہ رہا کہ اسلام کی دعوت بھی کوئی کام ہے جس کے لئے انھیں دوسری قوموں کے درمیان متحرک ہونا چاہئے۔ آج کوئی مسلم جماعت تو درکنار، پوری مسلم دنیا میں کوئی قابل ذکر فرد بھی نہیں جس کو حقیقی طور پر دعوت الی اللہ کا شعور ہو، اور وہ اس اہم ترین کام میں فی الواقع اپنے آپ کو لگائے ہوئے ہو۔

حضرت یونس علیہ السلام سے دعوت الی اللہ کے معاملہ میں جزئی اور اجتہادی کوتاہی ہوئی تھی۔ اس کے نتیجہ میں وہ مچھلی کے پیٹ میں ڈال دئے گئے۔ موجودہ زمانہ کے مسلمانوں نے یہی کوتاہی مکمل طور پر اور بدترین طور پر کی ہے۔ یہ بلاشبہ اللہ کی ناراضگی کی بات ہے۔ چنانچہ موجودہ زمانہ میں پوری ملت مسلمہ مسائل کے پیٹ میں ڈال دی گئی۔ مسائل کی مچھلی نے ان کو نگل رکھا ہے۔ یہ حالت کسی ایک ملک کی نہیں۔ ہندستان، پاکستان، بلاد عربیہ، اور دوسرے تمام علاقوں کے مسلمان مسائل کے شکنجہ میں گرفتار ہیں۔ ان کی ہر کوشش اس کی شدت میں اضافہ کر رہی ہے، وہ اس میں کوئی کمی نہیں کرتی۔

"مسائل کی مچھلی" کے پیٹ سے نکلنے کی ایک ہی صورت ہے۔ مسلمان اپنی غلطی کا اعتراف کریں۔ وہ اللہ کی طرف رجوع ہوں۔ وہ دوسری قوموں کو حریف اور رقیب سمجھنے کا مزاج ختم کریں۔ وہ ان سے مدعو والا معاملہ کریں۔ وہ ان کے اوپر دعوت الی اللہ کی ذمہ داریوں کو پورا کریں۔ یہی مسائل کے پیٹ سے نکلنے کا واحد راستہ ہے۔ اس کے سوا کوئی بھی دوسرا راستہ نہیں جو انھیں اس گرفتاری سے نجات دینے والا ہو۔

مسجد

"ہمارا مقصد مسجد والے اعمال کو زندہ کرنا ہے" تبلیغی جماعت کے لوگ جب یہ بات کہتے ہیں تو عام لوگوں کو بظاہر یہ ایک چھوٹی سی بات معلوم ہوتی ہے۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ یہ ایک بہت بڑی بات ہے، بلکہ یہی سب سے بڑی بات ہے۔ "مسجد والے اعمال" کو اگر کسی جامع معنی میں نہ لیا جائے تو اس میں دین کی ساری حقیقت آجاتی ہے۔

مسجد والے اعمال کیا ہیں۔ مسجد والے اعمال یہ ہیں کہ آدمی کے اندر دینی شعور پیدا کیا جائے۔ گہرائی کے ساتھ دیکھئے تو انسانی شعور ہی انسانی عمل کی بنیاد ہے۔ انسان کا خارجی عمل اس کے اندرونی شعور ہی کا خارجی ظہور ہوتا ہے۔ مسجد اسی ربانی شعور کی تعمیر کا مرکز ہے۔ اسی طرح ہر آدمی کا کوئی شعوری مرکز ہوتا ہے۔ ہر آدمی گویا کسی نہ کسی "مسجد" پر کھڑا ہوا ہے۔ دوسرے لوگ غیر خدائی مسجد پر کھڑے ہوتے ہیں۔ مسلمان وہ ہے جو خدائی مسجد کے اوپر اپنے آپ کو کھڑا کرے۔

ایک سیاح جس نے دنیا کے اکثر حصوں کا سفر کیا ہے، لکھتا ہے کہ مختلف ملکوں کے سفر کے دوران میں نے ایک عجیب بات یہ دیکھی کہ غیر مسلم ملکوں میں ہر جگہ قدیم زمانہ کے بڑے بڑے قلعے کھڑے ہوئے ہیں۔ جب کہ مسلم دنیا میں اس قسم کے مناظر بہت کم دکھائی دیتے ہیں۔ البتہ ہر مسلم شہر میں عالیشان مسجدیں ضرور ہیں جن کے اونچے مینار دور سے ان کے وجود کا پتہ دیتے ہیں۔ غیر مسلم ملکوں کی نمایاں عمارتیں اگر ان کے قلعے ہیں تو مسلم ملکوں کی نمایاں عمارتیں ان کی مسجدیں۔

یہ فرق دونوں قسم کے لوگوں کے مزاج کا پتہ دیتا ہے۔ غیر مسلم قوموں کا اعتماد مادی اسباب پر تھا، اس لئے انھوں نے قلعے اور حصار کھڑے کئے۔ اس کے برعکس مسلم قوموں کے عقیدہ کے مطابق ان کا اعتماد اللہ پر تھا۔ اس لئے وہ جہاں پہنچے، انھوں نے بڑی بڑی مسجدیں بنائیں۔

مسجد، محدود معنوں میں، صرف عبادت گھر نہیں، وہ اسلام کے حق میں خدائی قلعہ ہے۔ مسجدیں اسلامی دنیا کی نگہبان ہیں۔ مسجد کے ذریعہ اسلام اپنی حیثیت کو زمین پر قائم کرتا ہے۔ اس کے ذریعہ سے وہ دلوں کو مسخر کرتا ہے۔ اس کے ذریعہ مسلمانوں کی صفوں میں اتحاد قائم ہوتا ہے
ایک حدیث میں مسجد کو اللہ سے ڈرنے والوں کا گھر کہا گیا ہے (المساجد بیوت المتقین)

مسجد خدا کا گھر ہے۔ مسجد میں خدائی اعمال کے ذریعہ ایک ایسا ماحول پیدا کیا جاتا ہے جہاں آکر مسلمان اپنے آپ کو اپنے رب کی چھاؤں میں محسوس کریں۔ وہاں سے دینی معرفت کی غذا لے کر باہر کی دنیا کی طرف لوٹیں۔ خود اسلام پر قائم ہوں اور دوسرے بندگان خدا کو اسلام پر قائم رکھنے کی کوشش کریں۔

مسجد ایک قسم کا دار الاسلام ہے۔ وہ اللہ کی یاد کی جگہ ہے۔ وہ اسلامی اتحاد کی تربیت گاہ ہے۔ وہ مسلمانوں کے اعتماد علی اللہ کا نشان ہے۔ وہ اسلام کی دعوتی اور اصلاحی سرگرمیوں کا مرکز ہے جب اسلام زندہ تھا تو مسجد صرف مسجد نہ تھی بلکہ وہاں اسلامی زندگی کے تمام شعبے قائم ہوتے تھے۔ مثلاً عبادت گاہ، مدرسہ، دار القضاء، اجتماع گاہ، اسپتال، کتب خانہ، مسافر خانہ، مقام شاورت اصلاحی و تبلیغی مرکز وغیرہ۔

مصر میں جب بنی اسرائیل کے لئے زمین تنگ ہوگئی تو حکم ہوا کہ اپنے گھروں کو مسجد بنالو (یونس۔ ۸۷) اس سے معلوم ہوا کہ حالات جب اہل ایمان کو پسپا کرتے کرتے ان کو آخری جائے پناہ (گھر) تک پہنچا دیں تو اس وقت ان کا گھر ہی جدوجہد کا میدان بن جاتا ہے۔ وہ اپنے گھروں کو مسجد کی صورت دے کر وہاں اپنے کو صبر و نماز کے ساتھ وابستہ کر دیتے ہیں۔ وہ اعتماد علی اللہ اور تعلق مع اللہ میں اپنا مستقبل تلاش کرنے لگتے ہیں۔ مسجد اہل ایمان کے لئے صرف در و دیوار کا مجموعہ نہیں، وہ اپنے رب سے لپٹنے کے لئے تنہائی کا ماحول ہے۔ اور اللہ پر بھروسہ کا مزاج پیدا کرنے کے لئے مقام تربیت ہے۔ "مسجد اس بات کا نشان ہے کہ اہل ایمان کا قافلہ خواہ کتنا ہی پیچھے دھکیل دیا جائے، اس کے لئے ہر حال میں ایک نئے سفر کا نقطۂ آغاز موجود رہتا ہے۔ اس آخری قلعہ کو کسی حال میں کوئی ان سے چھین نہیں سکتا۔

اسی کے ساتھ مسجد کا ایک عمل اور بھی ہے۔ وہ یہ کہ مسجد کی دنیا میں خدا پرستی اور آخرت پسندی کا ماحول پیدا کر کے دوسری قوموں کے افراد کو موقع دیا جائے کہ وہ یہاں آکر اسلام کا مطالعہ و شاہدہ کریں۔ اور اس بات سے آگاہی حاصل کریں کہ ان کے رب کی مرضی ان کے بارہ میں کیا ہے اور موت کے بعد خدا کی عدالت میں ان سے کس قسم کا سوال کیا جانے والا ہے۔ مسجد کی یہ دعوتی اور تبلیغی حیثیت قرآن میں اس طرح بیان ہوئی ہے:

"اگر مشرکین میں سے کوئی شخص تجھ سے امان کا طالب ہو تو اس کو اپنے پاس آنے دو تاکہ وہ اللہ کا کلام سنے۔ پھر اس کو اس کے ٹھکانے تک پہنچا دو۔ یہ اس لئے کہ یہ لوگ علم نہیں رکھتے (توبہ ٦) معلوم ہوا کہ اسلام کا گھر، مسلمانوں کے لئے عبادت اور اصلاح کا مقام ہونے کے ساتھ، دوسری قوموں تک خدا کا پیغام پہنچانے کا مرکز بھی ہے۔ یہ جس طرح اسلام کے سمٹنے کی جگہ ہے، اسی طرح وہ اسلام کے پھیلنے کا نقطہ بھی ہے۔ یہاں خدا کا دین استحکام حاصل کرتا ہے اور یہیں سے وہ اپنے سفر کو بھی جاری کرتا ہے۔ یہ اسلام کا سمندر بھی ہے اور اس کا بھاپ اٹھنے کا مقام بھی۔

مسجد کے اندر تبلیغ کی تاثیر اور تبلیغ کی عظمت تاریخ سے ثابت ہے۔ مغل قبائل نے تیرھویں صدی عیسوی میں مشرق کی جانب سے عالم اسلام پر حملہ کیا، اور اس کے بڑے حصہ میں اسلام کے نشانات کو مٹا ڈالا۔ مگر اسلام کے انھیں کھنڈروں سے اسلام دوبارہ ایک تسخیری طاقت بن کر ابھرا۔ مغلوں نے اسلام قبول کر لیا۔ وہی مسجدیں جن کو ہلاکو نے سمرقند سے حلب تک اپنے راستہ میں تباہ کر دیا تھا، اس کے پوتوں نے دوبارہ ان مسجدوں کی تعمیر کی اور ان کی چھتوں کے نیچے خدائے واحد کے آگے سجدہ کیا۔

آج اسلام کو جو چیلنج درپیش ہے، اس کے جواب کی صورت یہ ہے کہ مسجد کو اس کے پورے معنوں میں زندہ کیا جائے۔ ایک عرب عالم دکتور حسین مونس کے یہ الفاظ نہایت صحیح ہیں :

ان الاسلام اليوم يخوض معركة	آج اسلام کو ایک جنگ کا سامنا ہے اور اس
والمساجد من اهم اسلحتنا فيها	میں مسجدیں ہمارا نہایت اہم ہتھیار ہیں۔

الوعی الاسلامی (کویت) رجب ١٣٩٣ھ، صفحہ ٦٠

عمل، ردّ عمل

رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نبوت سے پہلے تلاش حق میں بے چین رہتے تھے۔ یہاں تک کہ غار حرا میں خدا کا فرشتہ ظاہر ہوا، اس نے خدا کی طرف سے یہ حکم سنایا کہ اِقرأ (پڑھ) کیوں کہ اللہ تعالیٰ نے "قلم" کے ذریعہ انسانوں کی رہنمائی کا سامان کیا ہے (علم بالقلم علم الانسان مالم یعلم)

یہ واقعہ جو اپنی مخصوص صورت میں پیغمبرانہ سطح پر پیش آیا، یہی دوسروں سے بھی غیر پیغمبرانہ سطح پر مطلوب ہے۔ آج بھی ضرورت ہے کہ کوئی بندۂ خدا حق وصداقت کی جستجو میں بے چین ہو۔ اور پھر اس کو غیبی آواز پکار کر کہے کہ "پڑھ"۔ وہ اس پکار کی اتباع میں قرآن اور حدیث اور سیرت اور صحابہ کی زندگیوں کا گہرا مطالعہ کرے۔ اس مطالعہ کے بعد اس پر کھلے کہ امر حق کیا ہے۔ وہ اس کو لے اور اس کی روشنی میں لوگوں کو رہنمائی دینا شروع کرے۔

مگر موجودہ زمانہ میں جو مفکر اور رہنما اٹھے، ان میں سے کوئی بھی نہیں جو ان مراحل سے گزرا ہو۔ ہر ایک کا یہ حال ہوا کہ مسلم سلطنت کے زوال کے بعد پیدا ہونے والے حالات کو دیکھ کر وہ تڑپ اٹھا۔ اور مسلمانوں کی سیاسی، اقتصادی اور تہذیبی مغلوبیت ختم کرنے کے لیے "جہاد" کرنے لگا۔

اپنی حقیقت کے اعتبار سے یہ ردعمل تھا نہ کہ عمل۔ یہی وجہ ہے کہ موجودہ زمانہ میں اٹھنے والے مفکرین اور رہناؤں میں سے کوئی نہیں جو اسلام کی صحیح تشریح کرنے میں کامیاب ہوا ہو۔ ان کی ردعمل کی نفسیات نے انھیں اپنے مفروضہ دشمنوں کے خلاف محاذ آرائی کی طرف مائل کر دیا۔ جس کو وہ غلطی سے جہاد کہتے رہے۔

یہ مفکرین اگر مذکورہ پیغمبرانہ انداز میں اٹھتے تو ان کے اندر داعیانہ فکر ابھرتا، جیسا کہ پیغمبر کے اندر "حرا" کے تجربہ کے بعد ابھرا۔ مگر ان کی ردعمل کی نفسیات کی بنا پر ان کے اندر صرف مہاجمانہ (لڑائی بھڑائی) کا ذہن ابھر آیا۔ ان رہناؤں کی پرشور تحریکیں ملت کو کوئی مثبت فائدہ نہ پہونچا سکیں۔ البتہ ان کا نقصان یہ ہوا کہ پوری ملت کا ذہن خراب ہو گیا۔ مسلمان داعیانہ طرز فکر سے خالی ہو کر جنگ جویانہ طرز فکر پر قائم ہو گیے۔

موجودہ ملت مسلمہ کا بلاشبہ یہی سب سے بڑا مسئلہ ہے۔

تعلیم، تحریک

علی گڑھ کالج (موجودہ مسلم یونیورسٹی) کے ابتدائی زمانہ کا واقعہ ہے۔ ایک مسلمان نے اپنے لڑکے کو تعلیم کے لیے علی گڑھ بھیجا۔ روانگی سے قبل انھوں نے اپنے صاحبزادے کو جو ضروری ہدایات دیں، ان میں سے ایک ہدایت یہ تھی کہ "دیکھو، رائڈنگ کلب کے گھوڑے پر وضو کے بغیر سوار نہ ہونا"

اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ ابتدائی زمانہ میں علی گڑھ کے بارہ میں مسلمانوں کے جذبات کیا تھے۔ وہ لڑکوں کو گھوڑے پر چڑھاتے ہوئے "بسم اللہ" اور "وضو" کی تاکید کرتے تھے۔ اس کے باوجود کیا وجہ ہے کہ علی گڑھ میں وہ مسلم نسل تیار نہ ہو سکی جو دور جدید کی شہ سوار بن سکتی اور جدید چیلنج کا مقابلہ کرکے اسلام کو دوبارہ اس بلند مقام پر بٹھاتی جو دین فطرت ہونے کی حیثیت سے اس کے لیے ابدی طور پر مقدر کر دیا گیا ہے۔

اس کی وجہ یہ ہے کہ اس قسم کے انسان تحریک سے پیدا ہوتے ہیں نہ کہ تعلیم سے۔ تعلیم گاہ میں صرف زبان اور علوم سکھائے جاتے ہیں۔ وہاں پروفیشنل سرٹیفکیٹ دیئے جاتے ہیں۔ اور ایک تعلیم گاہ کے ذریعہ صرف اتنا ہی ہو سکتا ہے۔ تعلیم گاہ آدمی کو واقف کار بنا سکتی ہے۔ وہ آدمی کو اس قابل بنا دیتی ہے کہ وہ لکھنے اور پڑھنے لگے۔ مگر فکری انقلاب اور مقصدی حرکت اس سے الگ ایک چیز ہے، اور وہ کسی تعلیم گاہ کے ذریعہ کبھی پیدا نہیں کی جا سکتی۔

خود علی گڑھ میں اس کی ایک عملی مثال موجود ہے۔ طلبہ کے سرپرستوں کی مذکورہ تمناؤں یا یونیورسٹی میں تھیالوجی کے شعبہ سے وہاں کے طلبہ میں کبھی دینداری نہ آ سکی۔ مگر موجودہ زمانہ میں جب تبلیغی جماعت نے وہاں دعوتی اور تحریکی انداز میں محنت کی تو بہت سے طلبہ میں دینداری پیدا ہو گئی۔

ضرورت ہے کہ مسلم یونیورسٹی میں تعلیم کے ساتھ تحریک کا اضافہ کیا جائے۔ تحریک سے میری مراد طلبہ کی یونین نہیں ہے۔ وہ تو میرے نزدیک صرف بگاڑ پیدا کرنے کا ذریعہ بن سکتی ہے۔ میری مراد ایک ایسی تحریک سے ہے جو مکمل طور پر غیر سیاسی انداز کی ہو اور وقت کے فکری معیار پر اسلامی دعوت کا کام کرے۔ یہی تحریکی عمل اس بات کا ضامن ہوگا کہ علی گڑھ میں صرف ڈگری ہولڈر پیدا نہ ہوں بلکہ وہاں سے وہ انقلابی انسان تیار ہو کر نکلیں جو اسلام کی نئی تاریخ بنا سکیں۔

قرآن کا ترجمہ

۵ جنوری ۱۹۸۳ کا واقعہ ہے۔ میں افریقہ کے ایک سفر سے دہلی واپس آرہا تھا۔ روم میں ایک مستشرق ہمارے جہاز میں سوار ہوئے اور میری سیٹ کی بغل والی سیٹ پر بیٹھے۔ ان کا ذکر میں نے اپنے سفرنامہ مطبوعہ الرسالہ نومبر ۱۹۸۳ میں کیا ہے۔ اس مستشرق کا نام و پتہ حسب ذیل ہے۔

Dr. J. Oacek, Oriental Department,
Charles University, Prague, Czechoslovakia.

چیکوسلاواکیا کے اس مستشرق نے گفتگو کے دوران بتایا کہ چیکوسلواکیا کے ایک مستشرق نے قرآن کا ترجمہ چیک زبان میں کیا ہے۔ یہ ترجمہ چھپ کر شائع ہو چکا ہے۔ ان کے بیان کے مطابق یہ ترجمہ بہت اچھا ہے۔ وہ جب چھپ کر بازار میں آیا تو چند ہفتے کے اندر اس کے تمام نسخے فروخت ہو گئے۔

یہ ایک چھوٹی سی مثال ہے جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ موجودہ زمانہ میں دعوت اسلام کے کتنے زیادہ مواقع ہیں۔ آج ساری دنیا میں بے شمار لوگ ہیں جو اسلام کا مطالعہ اس کے اصل اور براہ راست ذرائع سے کرنا چاہتے ہیں۔ مگر ان کی مطلوبہ کتابیں ابھی ان کو بہت کم فراہم کی جا سکی ہیں۔ خاص طور پر ضرورت ہے کہ قرآن کا ترجمہ دنیا کی ہر چھوٹی بڑی زبان میں کیا جائے اور اس کو چھاپ کر بڑے پیمانہ پر ساری دنیا میں پھیلا دیا جائے۔

مگر مسلمانوں کو ابھی اس کام سے بہت کم رغبت ہو سکی ہے۔ جنوبی ہند کے ایک تعلیم یافتہ مسلمان نے مجھ سے کہا کہ میرے ایک عیسائی دوست نے قرآن کا ایک ترجمہ خریدا۔ اس کے بعد جب اس عیسائی دوست سے ملاقات ہوئی تو اس نے کہا کہ آپ لوگ عیسائیوں کا مقابلہ نہیں کر سکتے۔ مجھے قرآن کے ترجمہ کی ضرورت تھی تو وہ مشکل سے مجھے اتنی قیمت پر ملا۔ اس کے برعکس عیسائیوں کا یہ حال ہے کہ اگر میں ٹیلی فون کر دوں کہ مجھے مفت تقسیم کے لئے انجیل کی ضرورت ہے تو چند گھنٹے کے اندر پانچ ہزار نسخے میرے دفتر میں آجائیں گے۔

سعودی عرب اور بعض دوسرے مسلم ممالک نے موجودہ زمانہ میں یہ اہتمام کیا ہے کہ وہ قرآن کے ترجمے چھاپ کر پھیلانے کی کوشش کر رہے ہیں۔ مگر یہ کوششیں اصل ضرورت کے مقابلہ میں ابھی بہت کم ہیں۔ اور ان کا ترجمہ بھی پوری طرح قابل اعتماد نہیں۔

مسلمان سچے دین کے حامل ہیں۔ ان کا سب سے بڑا کام یہ ہے کہ خدا کے دین کو اس کے تمام بندوں تک پہنچائیں۔ مگر یہی وہ کام ہے جس سے آج مسلمان سب سے زیادہ دور ہو رہے ہیں۔

داعیانہ عمل، داعیانہ رویہ

ایک دکان دار وہ ہے جو دکان کھولنے کے بعد ہر طرف اس کا اعلان بھی کرے۔ اخبار، ریڈیو، ٹیلی وژن اور دوسرے ذرائع ابلاغ کو استعمال کرکے اس کو پوری آبادی میں مشتہر کرنے کی کوشش کرے۔ دوسرا دکان دار وہ ہے جو دکان کھولنے کے بعد اس کا اشتہار تو نہ کرے، البتہ اپنی دکان میں دکاندار کی طرح رہے ــــ وہ اپنی دکان میں صحیح سامان رکھے، لوگوں سے میٹھا بول بولے۔ لین دین میں کسی کو شکایت کا موقع نہ دے۔

پہلا دکان دار بلاشبہ بڑی کامیابی حاصل کرے گا۔ وہ اپنی تجارت کو توسیعی تجارت بنا دے گا۔ مگر دوسرا دکان دار بھی اپنی تجارت کو نفع بخش بنانے میں کامیاب رہے گا۔ پہلا دکان دار اگر "کروروں" روپیہ کمائے گا تو دوسرا دکان دار بھی "لاکھوں" روپیہ حاصل کرلے گا۔ پہلے اور دوسرے میں صرف مقدار کا فرق ہوگا نہ کہ نوعیت کا۔

اسی مثال سے اسلام اور مسلمانوں کے معاملہ کو سمجھا جاسکتا ہے۔ ایک صورت یہ ہے کہ مسلمان پورے معنوں میں داعی بن کر رہیں۔ وہ منصوبہ بند انداز میں دوسری قوموں تک اسلام کا پیغام پہونچائیں۔ وہ دین اسلام کے باقاعدہ مبلغ بن جائیں۔ اگر مسلمان ایسا کریں تو یہ ان کے لیے بہت بڑے فضل کی بات ہے۔ یہ وہ عمل ہے جو کسی گروہ کو دنیا اور آخرت میں سب سے بڑے انعام کا مستحق بناتا ہے۔

دوسری صورت یہ ہے کہ مسلمان باقاعدہ اور براہِ راست انداز میں دعوتی جدوجہد نہ کریں۔ تاہم وہ اپنی ذاتی اور جماعتی زندگی میں داعیانہ رویہ اختیار کریں۔ وہ دوسری قوموں کو حریف سمجھنے کے بجائے مدعو سمجھیں۔ وہ اللہ سے لوگوں کی ہدایت کے طالب ہوں۔ غیر مسلم افراد سے تعلقات کے دوران اسلامی اخلاق کا لحاظ رکھیں۔ غیر مسلموں کی طرف سے زیادتی کا تجربہ ہو تو اس کو برداشت کرلیں۔ ہر اس کارروائی سے اپنے آپ کو بچائیں جو غیر مسلموں اور مسلمانوں کے درمیان کھنچاؤ اور نفرت پیدا کرنے والی ہو۔ مسلمان اگر یہ دوسرا رویہ اختیار کریں تب بھی وہ اللہ تعالیٰ کے یہاں رحمت اور انعام کے مستحق قرار پائیں گے۔

اسلام کی تاریخ بتاتی ہے کہ باقاعدہ اور منظم انداز میں تبلیغ کا کام زیادہ تر مکہ کے ۱۳ سالہ دور میں ہوا۔ تاہم اسلام ہر زمانہ میں تیزی سے پھیلتا رہا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ مسلمان خواہ براہ راست داعیانہ عمل نہ کریں، تاہم وہ داعیانہ رویہ پر ہمیشہ قائم رہے۔ یہی خاص سبب ہے جس کی بنا پر اسلام کے پھیلنے کا سلسلہ تاریخ کے ہر دور میں رکے بغیر جاری رہا۔

دلیل کی سطح پر

قرآن میں ارشاد ہوا ہے کہ: اور ہم نے لوگوں کے لیے اس قرآن میں ہر قسم کا مضمون کھول کھول کر بیان کیا ہے، پھر بھی اکثر لوگ انکار ہی کیے جا رہے ہیں۔ اور وہ کہتے ہیں کہ ہم ہرگز تم پر ایمان نہ لائیں گے جب تک تم ہمارے لیے زمین سے کوئی چشمہ جاری نہ کر دو یا تمہارے پاس کھجوروں اور انگوروں کا کوئی باغ ہو جائے۔ پھر تم اس باغ کے بیچ میں خوب نہریں جاری کر دو۔ یا جیسا کہ تم کہتے ہو، ہمارے اوپر آسمان سے ٹکڑے گرا دو یا اللہ اور فرشتوں کو لاکر ہمارے سامنے کھڑا کر دو یا تمہارے پاس سونے کا کوئی گھر ہو جائے۔ یا تم آسمان پر چڑھ جاؤ اور ہم تمہارے چڑھنے کو بھی نہ مانیں گے جب تک تم وہاں سے ہم پر کوئی کتاب نہ اتار دو جس کو ہم پڑھیں۔ کہو کہ میرا رب پاک ہے، میں تو صرف ایک بشر ہوں، اللہ کا رسول۔ اور جب ان کے پاس ہدایت آگئی تو ان کو ایمان لانے سے اس کے سوا کوئی اور چیز مانع نہیں ہوئی کہ انھوں نے کہا کہ کیا اللہ نے بشر کو رسول بنا کر بھیجا ہے۔ کہو کہ اگر زمین میں فرشتے ہوتے کہ وہ اس میں چلتے پھرتے تو البتہ ہم ان پر آسمان سے فرشتہ کو رسول بنا کر بھیجتے۔ کہو کہ اللہ میرے اور تمہارے درمیان گواہی کے لیے کافی ہے، بے شک وہ اپنے بندوں کو جاننے والا، دیکھنے والا ہے۔ اللہ جس کو راہ دکھائے وہی راہ پانے والا ہے۔ اور جس کو وہ بے راہ کر دے تو تم ان کے لیے اللہ کے سوا کسی کو مددگار نہ پاؤ گے۔ اور ہم قیامت کے دن ان کو ان کے منھ کے بل اندھے اور گونگے اور بہرے اکٹھا کریں گے۔ ان کا ٹھکانہ جہنم ہے (بنی اسرائیل ۸۹ - ۹۷)

ہر زمانہ میں یہ واقعہ پیش آیا ہے کہ لوگوں نے حق کے داعی کی بات کو ماننے سے انکار کیا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ جب بھی کوئی حق کا داعی اٹھتا ہے تو بظاہر وہ صرف ایک "بشر" ہوتا ہے۔ اس کے ساتھ تاریخی عظمتیں جمع نہیں ہوتیں۔ اس لیے لوگ اس کو ایک عام آدمی سمجھ کر اسے نظر انداز کر دیتے ہیں۔

حق ہمیشہ دلیل کی سطح پر ظاہر ہوتا ہے نہ کہ ظاہری عظمتوں کی سطح پر۔ جو لوگ حق کو دلیل کی سطح پر نہ پائیں وہ اللہ کی نظر میں اندھے اور بہرے ہیں۔ آخرت میں ان کی اندرونی حقیقت ظاہر ہو جائے گی۔ وہاں وہ اس حال میں اٹھیں گے کہ وہ آنکھ رکھتے ہوئے اندھے ہوں گے اور کان رکھتے ہوئے بہرے۔

چالیس سال بعد

نکولا چاؤسسکو (Nicolae Ceausescu) رومانیہ کا کمیونسٹ لیڈر تھا۔ ۱۹۴۸ میں وہ رومانیہ کا وزیر زراعت بنا۔ اس کے بعد وہ ترقی کرتا رہا۔ یہاں تک کہ ۱۹۶۷ میں وہ رومانیہ کا صدر بن گیا۔ اپنے اقتدار کو مستحکم کرنے کے لیے اس نے ہر ممکن کارروائی کی۔ اسی میں یہ تھا کہ اس نے اپنی بیوی الینا (Elena) کو نائب صدر بنایا اور بیشتر کلیدی عہدوں پر اپنے رشتہ داروں کو بٹھا دیا

چاؤسسکو نے طاقت کے ذریعہ اپنے تمام مخالفین کو کچل دیا۔ رومانیہ کے مشہور شاعر اینڈرین پاؤنیسکو کے ذریعہ اس نے ایک نظم تیار کرائی جو "نغمہ رومانیہ" کہی جاتی تھی۔ اس میں چاؤسسکو کو "رومانوی قوم کا سب سے زیادہ محبوب فرزند" قرار دیا گیا تھا۔ یہ نظم روزانہ مختلف مواقع پر سارے رومانیہ میں پڑھی جاتی تھی۔ رومانیہ کے لوگوں کو یہ بات ناپسند تھی کہ ملک کے تمام وسائل صرف ایک شخص کے اوپر وقف کر دیے جائیں۔ آخر کار دسمبر ۱۹۸۹ میں یہ لاوا پھٹ پڑا۔ عوام اور فوج دونوں نے چاؤسسکو کے خلاف بغاوت کر دی۔ چاؤسسکو نے اپنی حفاظت کے لیے اتنی بڑی پولیس بنا رکھی تھی جو فوج سے بھی زیادہ طاقت ور تھی۔ چنانچہ سخت تصادم ہوا۔ ستر ہزار آدمی مر گئے۔ اور تین سو ہزار آدمی زخمی ہوئے۔

چاؤسسکو اپنے وسیع محل میں ہر وقت ایک ہیلی کاپٹر تیار رکھتا تھا۔ جب اس نے دیکھا کہ اب وہ اپنے اقتدار کو بچا نہیں سکتا تو وہ ہیلی کاپٹر پر بیٹھ کر فرار ہو گیا۔ اس کو اندیشہ ہوا کہ اس کا ہیلی کاپٹر مار کر گرا دیا جائے گا۔ چنانچہ وہ ایک مقام پر اتر کر زیر زمین پناہ گاہ (bunker) میں داخل ہو کر چھپ گیا۔ تاہم وہ یہاں بھی پکڑ لیا گیا اور عین کرسمس کے دن ۲۵ دسمبر ۱۹۸۹ کو چاؤسسکو اور اس کی بیوی الینا کو گولی مار کر ہلاک کر دیا گیا ــــــ آسمان نے بھی اس کو جگہ دینے سے انکار کر دیا اور زمین نے بھی۔

چاؤسسکو اسٹالنسٹ اشتراکی تھا۔ وہ مذہب کا انتہائی سخت دشمن تھا۔ بخارسٹ کا ریڈیو اناؤنسر اس کی موت کی خبر دیتے ہوئے چلا اٹھا، اس نے کہا کہ اف، کیسی حیرت ناک خبر ہے۔ مسیح دشمن عین کرسمس کے دن مر گیا:

Oh, what wonderful news. The anti-Christ died on Christmas Day.

اس طرح کے واقعات ۱۹۸۹ میں کثرت سے پیش آئے ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ظالم انسانوں نے مذہب کے خلاف جو قلعے بنائے تھے، وہ خدا کی طرف سے مسلسل ڈھائے جا رہے ہیں۔

روس میں سرکاری طور پر مذہب کا مکمل خاتمہ کر دیا گیا تھا۔ مگر حالات کا دباؤ اتنا بڑھا کہ روس کی اشتراکی حکومت کو اپنے یہاں مذہبی آزادی کا اعلان کرنا پڑا۔ سوویت روس کے وزیر اعظم میخائیل گورباچوف نے خود ویٹیکن پہونچ کر پوپ سے ملاقات کی۔ مشرقی جرمنی میں مذہب کو بظاہر مکمل طور پر ختم کر دیا گیا تھا۔ مگر وہ بالآخر سیلاب بن گیا اور برلن دیوار (Berlin wall) توڑ کر باہر آگیا۔ چاؤسسکو اپنے سارے اقتدار اور اہتمام کے باوجود بری طرح ہلاک کر دیا گیا۔ وغیرہ

اس طرح براہ راست خدا کی طرف سے مذہب کی تبلیغ و اشاعت کے مواقع کھولے جا رہے ہیں۔ اِس وقت مسلمانوں کے لیے سب سے اہم کام یہ ہے کہ وہ دنیا کی ہر زبان میں قرآن اور حدیث اور سیرت پر سادہ اور سائنٹفک انداز کی کتابیں تیار کر کے تمام قوموں میں پھیلا دیں۔

موجودہ زمانہ میں مسلمانوں نے اسلام کے نام پر کافی سرگرمی دکھائی ہے۔ مگر یہ سرگرمیاں زیادہ تر سیاست رخی رہی ہیں۔ اب ضرورت ہے کہ تمام سرگرمیوں کو دعوت و تبلیغ کے رخ پر چلایا جائے۔ آج کے انسان کو "سیاسی مذہب" سے کوئی دل چسپی نہیں۔ وہ "روحانی مذہب" کا متلاشی ہے۔ وہ اپنی فطرت میں اٹھنے والی طلبِ خداوندی کا جواب چاہتا ہے۔ اگر اس وقت جدید انسان کے سامنے اسلام کو اس کی سادہ اور فطری صورت میں پیش کر دیا جائے تو انسان محسوس کرے گا کہ یہی وہ چیز ہے جس کو وہ اپنے اندرونی تقاضے کے تحت تلاش کر رہا تھا۔

اللہ تعالیٰ نے تمام ضروری اسباب مہیا کر دیے ہیں۔ اب مسلمانوں کا فرض ہے کہ وہ اٹھیں اور اسلام کو ہر خیمہ اور ہر گھر میں پہونچا دیں۔

دعوتی قوت

مکہ کے آخری دور میں جب قریش کا ظلم مسلمانوں پر بہت بڑھ گیا تو رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے مسلمانوں سے کہا کہ وہ مکہ چھوڑ کر حبش چلے جائیں۔ چنانچہ اسّی سے اوپر کچھ لوگ حبش کی طرف ہجرت کر گئے۔ یہ اگرچہ ایک بہت تکلیف دہ واقعہ تھا۔ مگر اس میں اللہ نے خیر کی صورت پیدا فرما دی۔ اس کے ذریعہ اسلام کی دعوت بین اقوامی دائرہ میں داخل ہو گئی۔

حبش کی طرف ہجرت کرنے والے مسلمانوں کی زندگی سراپا دعوت تھی۔ ان کی تبلیغ اور عمل سے بہت سے لوگ متاثر ہوئے چنانچہ حبش سے عیسائیوں کی ایک جماعت تحقیق حال کے لئے مکہ آئی۔ ان کی تعداد تیس سے اوپر تھی۔ وہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم سے ملے اور آپ کی زبان سے اسلام کا پیغام سُنا۔ آپ نے قرآن کے حصے پڑھ کر انھیں سنائے۔ وہ اتنا متاثر ہوئے کہ سب کے سب اسلام کے دائرہ میں داخل ہو گئے۔

ابوجہل کو یہ واقعہ معلوم ہوا تو وہ آیا اور ان لوگوں سے کہا:

ما رأينا ركبا احمق منكم ۔ ارسلكم قومكم تعلمون خبر هذا الرجل فلم تطمئن بها لسكم عنده حتى فارقتم دينكم وصدقتموه فيما قال فقالوا سلام عليكم لا نجاهلكم لنا ما نحن عليه ولكم ما انتم عليه۔

ہم نے تم سے زیادہ احمق کوئی قافلہ نہیں دیکھا تمہاری قوم نے تم کو اس لئے بھیجا کہ تم اس آدمی کی خبر لاؤ۔ مگر تمہارا حال یہ ہوا کہ اس کے ساتھ بیٹھتے ہی تم نے اپنا دین چھوڑ دیا اور اس کا اعتراف کر لیا انھوں نے جواب دیا: تم پر سلامتی ہو، ہم تم سے بحث نہیں کرتے۔ ہمارے لئے وہ ہے جس پر ہم ہیں اور تمہارے لئے وہ ہے جس پر تم ہو۔

حبش کے ان ایمان لانے والوں کا رویہ اللہ کو پسند آیا اور ان کے مطابق سورہ قصص کی آیات ۵۲-۵۵ اتریں۔

دعوت ایک ایسا قیمتی ہتھیار ہے جو ہر حال میں اپنا کام کرتا رہتا ہے، خواہ داعی غالب ہو یا مغلوب۔ سچے داعی۔ کے خلاف اس کے دشمنوں کی ہر کوشش الٹی پڑتی ہے۔ یہ داعی کا ایسا (Advantage) ہے جو داعیٔ حق کے سوا کسی اور کو میسر نہیں۔ داعی ہر حال میں تسخیری صفت رکھتا ہے، خواہ بظاہر اس کے پاس کوئی قوت موجود نہ ہو

ایک حدیث

حدیث کی کتابوں میں دور آخر کے بارہ میں بہت سی پیشین گوئیاں ہیں۔ انھیں میں سے ایک پیشین گوئی وہ ہے جس کو امام احمد اور دوسرے محدثین نے نقل کیا ہے :

عن المقداد انہ سمع رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یقول، لا یبقی علی ظہر الارض بیتُ مَدَرٍ ولا وبرٍ الا ادخلہ اللہ کلمۃ الاسلام بعزّ عزیزٍ وذُلّ ذلیلٍ اما یُعزّہم اللہُ فیجعلہم من اہلہا او یذلہم فیدینون لہا

(مشکاۃ المصابیح، الجزء الاول، صفحہ ۲۰)

حضرت مقداد کہتے ہیں کہ انھوں نے رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کو یہ کہتے ہوئے سنا کہ زمین کی سطح پر کوئی خیمہ یا گھر باقی نہ رہے گا مگر یہ کہ اللہ اس میں اسلام کے کلمہ کو داخل کر دے گا، خواہ عزیز کی عزت کے ساتھ یا ذلیل کی ذلت کے ساتھ۔ اللہ یا تو انھیں عزت دے گا اور ان کو اہل اسلام میں سے بنا دے گا یا انھیں ذلیل کرے گا تو وہ اس کے دین کو اختیار کرلیں گے۔

یہ حدیث بتاتی ہے کہ آخری زمانہ میں اسلام ہر گھر میں داخل ہو جائے گا۔ مگر حدیث کے الفاظ کے مطابق، جو چیز گھروں کے اندر داخل ہو گی وہ اسلام کا کلمہ ہو گا نہ کہ اسلام کا سیاسی اور حکومتی اقتدار۔ کچھ لوگوں نے اس پیشین گوئی کو سیاسی داخلہ کے معنی میں لے لیا ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ وہ لوگ ساری دنیا میں اسلام کا سیاسی جھنڈا لہرانے کے نام پر مدعو اقوام سے سیاسی لڑائی چھیڑے ہوتے ہیں۔ اس بے معنی لڑائی کا نتیجہ یہ ہے کہ لوگ اسلام سے بیزار ہو کر اس سے دور ہوتے جا رہے ہیں۔

اس پیشین گوئی کو واقعہ بنانے کے لیے مسلمانوں کو جو کام کرنا ہے وہ دعوت الی اللہ ہے۔ انھیں چاہیے کہ وہ توحید اور آخرت کے ربانی پیغام سے تمام قوموں کو باخبر کرنے میں ہمہ تن مصروف ہو جائیں، وہ اسلام کو فکری حیثیت سے ایک معلوم اور مسلّم چیز بنا دیں، تاکہ جس کو ماننا ہے وہ مانے، اور جس کو نہیں ماننا ہے اس پر حجت قائم ہو جائے۔

عمل تبلیغ کی انتہا اتمام حجت ہے نہ کہ قیام حکومت۔

باب سوم :

واقعاتِ دعوت

تعارف اسلام

دہلی کی جامع مسجد کے پاس تھیوسوفیکل سوسائٹی کی ایک لائبریری ہے۔ مجھے مسز اینی بسنٹ کی ایک کتاب کی تلاش تھی۔ اس کتاب کو لینے کے لیے میں مذکورہ لائبریری میں ۲۴ جون ۱۹۷۹ کو گیا۔ یہ اتوار کا دن تھا۔ حسب معمول اس دن ان کا ہفتہ وار اجتماع تھا۔ کتاب حاصل کرنے کے بعد دن کو ۱۰ بجے میں ان کے اجتماع میں شریک ہوگیا۔ یہ پڑھے لکھے لوگوں کا اجتماع تھا۔ نیا چہرہ دیکھ کر انھوں نے مجھ سے فرمائش کی "آپ بھی اپنے وچار رکھیں"۔ میں نے کہا کہ میں قرآن کا طالب علم ہوں اگر آپ پسند کریں تو میں یہ کر سکتا ہوں کہ یہ بتاؤں کہ قرآن کی تعلیم کیا ہے، انھوں نے کہا۔ ضرور۔ آپ یہی بتائیے۔ ہم آپ سے اسی موضوع پر سنا چاہتے ہیں۔

اس کے بعد میں نے تقریباً آدھ گھنٹہ تقریر کی۔ اس تقریر میں سادہ انداز میں توحید، آخرت اور جنت وجہنم کی وضاحت کی۔ میں نے بتایا کہ قرآن کے مطابق زندگی کا اصل مسئلہ موجودہ دنیا کا مسئلہ نہیں ہے بلکہ موت کے بعد آنے والی دنیا کا مسئلہ ہے۔ قرآن یہ بتاتا ہے کہ موجودہ دنیا میں ہم کس طرح زندگی گزاریں کہ ہماری اگلی زندگی کامیاب رہے۔ تمام لوگ بہت غور سے میری تقریر سنتے رہے۔ تقریر کے بعد سوالات بھی ہوئے جن کا میں نے اسلامی تعلیمات کی روشنی میں جواب دیا۔

تقریر ختم ہونے کے بعد مجمع سے ایک صاحب اٹھ کر میرے پاس آئے اور میرا پتہ معلوم کیا۔ میں نے اپنا پورا پتہ بتا دیا۔ انھوں نے کہا کہ پٹیل نگر (نئی دہلی) میں تھیاسوفیکل سوسائٹی کا لاج ہے۔ وہاں زیادہ بڑے پیمانہ پر ہمارا پروگرام ہوتا ہے۔ ہم وہاں پر آپ کی تقریر رکھنا چاہتے ہیں۔ انھوں نے بتایا کہ ہم ایک ساتھ ایک مہینہ (چار ہفتہ وار اجتماعات) کا پروگرام بنا کر چھپوا لیتے ہیں اور اس کو تمام ممبروں تک بھیج دیتے ہیں۔ اب ۱۵ جولائی تک ہمارا پروگرام سٹ ہو چکا ہے۔ اس کے بعد کسی تاریخ کو ہم آپ کو زحمت دینا چاہتے ہیں۔ اس کے بعد میری دوسری تقریر ۱۵ جولائی ۱۹۷۹ کو ہوئی۔ اس کا عنوان تھا: قرآن کا پیغام۔ ملک کے اکثر حصوں میں غیر مسلم حضرات کے اس طرح کے اجتماعات برابر ہوتے رہتے ہیں۔ وہ لوگ اس کو پسند کرتے ہیں کہ دوسرے لوگ بھی وہاں آئیں اور سنجیدہ انداز میں اپنی بات پیش کریں۔ اسلام کے تعارف کے سلسلہ میں ہمیں جو کچھ کرنا ہے۔ اس کے سلسلہ میں ایک کام یہ بھی ہے کہ اس طرح کے اجتماعات میں پہونچیں اور ان مواقع سے فائدہ اٹھائیں۔

پیغمبر کا طریقہ

سیرت رسول کے مشہور راوی ابن اسحاق کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جب اپنی قوم کے سامنے اسلام کا اظہار کیا اور کھلم کھلا اس کا اعلان فرمایا، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو حکم دیا تھا تو آپ کی قوم نے آپ سے دوری اختیار نہ کی اور نہ انھوں نے آپ کا انکار کیا۔

یہاں تک کہ آپ نے ان کے بتوں کا ذکر کیا اور ان پر عیب لگائے۔ جب آپ نے ایسا کیا تو انھوں نے آپ کے معاملہ کو اہمیت دی اور آپ سے اجنبیت برتنے لگے۔ وہ آپ کی مخالفت اور دشمنی پر متحد ہو گیے۔ سوا ان لوگوں کے جنھیں اللہ تعالیٰ نے اسلام کے ذریعہ بچا لیا۔ ایسے لوگ تھوڑے تھے اور چھپے ہوئے تھے:

فلما بادیٰ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قومہ بالاسلام وصدع بہ کما امرہ اللہ لم یبعد منہ قومہ ولم یردّوا علیہ۔ حتی ذکر آلہتھم وعابھا۔ فلما فعل ذلک اعظموہ وناکروہ واجمعوا خلافہ وعداوتہ الامن عصم اللہ تعالیٰ منھم بالاسلام وھم قلیل مستخفون (سیرۃ ابن ہشام، الجزء الاول، صفحہ ۲۷۶-۲۷۵)

قدیم عرب کے مشرکوں کے بت دراصل ان کے قومی اکابر تھے جن کی تصویر بنا کر وہ ان کی تعظیم اور پرستش کرتے تھے۔ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم جب تک توحید اور اخلاق کی بات کرتے رہے، تو مشرکین نے آپ کی بات کو برا نہ مانا۔ مگر جب آپ نے غیر خداؤں کی تقدیس اور پرستش کو غلط بتایا اور مشرکین کی غیر خدا پرستانہ روش پر تنقید کی تو وہ بگڑ گیے۔ یہی ہر زمانہ کا معاملہ ہے۔ اگر لوگوں کے سامنے عمومی انداز میں صرف اخلاق اور انسانیت کی باتیں کیجئے تو ہر ایک آپ سے راضی رہے گا۔ لیکن اگر حق کی عمومی دعوت کے ساتھ لوگوں کی خلافِ حق روش پر تنقید کی جائے اور ان کے اکابر کا تجزیہ کیا جانے لگے تو فوراً لوگ بپھر اٹھیں گے۔ مگر پیغمبر کا طریقہ یہی ہے کہ دعوت کے ساتھ تجزیہ بھی کیا جائے۔ نصیحت کے ساتھ تنقید بھی کی جائے۔

جو لوگ غیر خدا کو خدا کا مقام دیئے ہوئے ہوں وہی تنقید پر بپھرتے ہیں۔ جو لوگ ایک خدا کی عظمتوں میں جی رہے ہوں وہ کسی انسان پر تنقید سے کبھی نہیں بپھریں گے۔

اسلامی طریقہ

حدیث اور سیرت کی کتابوں میں آتا ہے کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے حکم دیا کہ بتوں کو توڑ دیا جائے۔ مثلاً مسند احمد کی ایک روایت حسب ذیل ہے:

عن ابی محمد الھذلی عن علی قال کان رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم فی جنازۃ فقال ایکم ینطلق الی المدینۃ فلا یدع بہا وثنا الا کسرہ ولا قبرا الا سواہ ولا صورۃ الا لطخہا

ابو محمد ہذلی علی بن ابی طالب سے روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم ایک جنازہ میں تھے۔ آپ نے کہا تم میں سے کون ہے جو مدینہ جائے اور وہاں کوئی بت نہ چھوڑے جس کو اس نے توڑ نہ دیا ہو۔ اور کوئی قبر نہ چھوڑے جس کو اس نے برابر نہ کر دیا ہو۔ اور کوئی تصویر نہ چھوڑے جس کو اس نے مٹا نہ دیا ہو۔

اسی طرح رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے مکہ اور طائف اور دوسرے مقامات کے بتوں اور مجسموں کو توڑا۔ مگر اس عمل کا تعلق صرف عرب سے تھا۔ عرب کو چونکہ خدا کے حکم کے مطابق شرک اور آثار شرک سے پاک کرنا تھا۔ اس لئے وہاں کے لئے آپ نے یہ طریقہ اختیار فرمایا۔ تاہم اس قسم کی تمام کارروائیاں فتح کے بعد ہوئیں، نہ کہ فتح سے پہلے۔

عرب کے علاوہ دوسرے مقامات کے لئے یہ اصول نہ تھا کہ وہاں کے بتوں اور مجسموں کو توڑا جائے۔ دوسرے ملکوں میں صرف تبلیغ کے اصول پر عمل کیا گیا اور سرکاری طور پر بتوں کو توڑنے کے بجائے اس کا انتظام کیا گیا کہ غیر مسلم اقوام مسلمان ہو جائیں اور اس کے بعد اپنے آپ ان کے بتوں کا خاتمہ ہو جائے

حضرت عمر بن خطاب کی خلافت کے زمانہ میں بہت سے عیسائی علاقے مسلمانوں کے قبضہ میں تھے۔ مگر ان کے بتوں کو توڑنے کی کبھی کوشش نہیں کی گئی۔ مسلمان ایسے مکان یا عبادت گاہ میں داخل ہونے سے بچتے تھے۔ وہ ایسے لوگوں پر تبلیغ و دعوت کا کام کرتے تھے مگر اقتدار کے باوجود انھوں نے کبھی ایسا نہیں کیا کہ ان کے بتوں کو توڑنے لگیں۔ ایک روایت میں آتا ہے:

قال عمر رضی اللہ عنہ انا لاندخل کنائسکم من اجل التماثیل التی فیہا الصور (بخاری)

حضرت عمر نے عیسائیوں سے کہا کہ ہم تمہارے عبادت خانوں میں اس لئے داخل نہیں ہوتے کہ ان میں

۱۴ھ میں حضرت سعد بن وقاص کی سرکردگی میں مدائن فتح ہوا۔ مدائن قدیم ایرانی شہنشاہوں کا دارالسلطنت تھا۔ یہیں ان کا مشہور قصر ابیض (سفید محل) تھا۔ آخری ایرانی حکمران یزدجرد جب محل چھوڑ کر بھاگا تو حضرت سعد بن وقاص مدائن کے فاتح کی حیثیت سے قصر ابیض میں داخل ہوئے۔ اس وقت آپ کی زبان پر سورہ دخان کی آیات ۲۵۔ ۲۸ تھیں۔

یہ جمعہ کا دن تھا۔ قصر ابیض میں جس جگہ شہنشاہ کا تخت ہوتا تھا وہاں منبر رکھا گیا آپ نے اس منبر پر کھڑے ہو کر خطبہ دیا اور جمعہ ادا کیا۔ یہ پہلا جمعہ تھا جو قدیم ایران کے دارالسلطنت میں ادا کیا گیا۔

فتح مدائن کے جو واقعات تاریخ کی کتابوں میں آئے ہیں ان میں سے ایک واقعہ یہ ہے کہ شاہی محل میں جتنی بھی تصویریں اور مجسمے تھے سب بدستور باقی رکھے گئے۔ حضرت سعد بن وقاص نے نہ ان کو توڑا اور نہ ان کو وہاں سے جدا کیا۔ اس سلسلے میں یہاں تاریخ کے دو حوالے نقل کیے جاتے ہیں:

ثم انتھی الی ایوان کسریٰ وصلی فیہ صلوٰۃ الفتح و لا صلی جماعۃ فصلی ثمانیۃ رکعات لا یفصل بینھن و اتخذہ مسجداً وفیہ تماثیل الجص رجال وخیل ولم یمتنع و لا المسلمون لذالک وترکوھا علی حالھا (تاریخ الطبری، جلد۴) واتخذ سعد ایوان کسریٰ مصلی ولم یغیر ما فیہ من التماثیل (الکامل فی التاریخ جلد ۲)

سعد بن ابی وقاص ایوان کسریٰ پہنچے۔ اور اس کے اندر فتح کی نماز پڑھی۔ اور جماعت نہیں کی۔ انھوں نے آٹھ رکعتیں پڑھیں، ان کے درمیان فصل نہیں کیا (ایک سلام سے آٹھ رکعتیں) اور اس کو مسجد بنایا حالانکہ اس میں انسان اور گھوڑے کے مجسمے موجود تھے۔ اور نہ سعد بن ابی وقاص نے اور نہ مسلمانوں نے اس سے تعرض کیا اور ان کو ان کے حال پر چھوڑ دیا۔ اور سعد بن ابی وقاص نے کسریٰ کے ایوان کو مسجد بنایا اور اس میں جو مجسمے تھے ان میں کوئی تبدیلی نہ کی۔

صحابہ کرام نے جو کچھ کیا اس کی وجہ ان کا داعیانہ مزاج تھا۔ وہ اس قسم کے معاملات کو ہمیشہ دعوتی نقطۂ نظر سے دیکھتے تھے۔ ان کا داعیانہ مزاج سب سے زیادہ اہمیت کے ساتھ جو چیز ان کے سامنے لاتا تھا وہ غیر مسلم اقوام کو دعوت حق کا مخاطب بنانا تھا۔ بقیہ تمام چیزیں ان کی نظر میں ثانوی تھیں۔ وہ یقین رکھتے تھے کہ اسلام میں اتنی زبردست فکری قوت ہے کہ غیر مسلم اقوام اس کے آگے مسخر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتیں۔ اور جب قومیں مسخر ہو جائیں تو بقیہ تمام مقاصد اپنے آپ حاصل ہو جاتے ہیں۔ اس کے بعد شرک بھی مٹ جاتا ہے اور شرک کے تمام آثار اور علامات بھی۔

جوہری فرق

واذا تتلی علیھم آیاتنا قالوا قد سمعنا لونشاء لقلنا مثل ھذا ان ھذا الا اساطیر الاولین (الانفال ۳۱)	اور جب ان کے سامنے ہماری آیتیں پڑھی جاتی ہیں تو وہ کہتے ہیں کہ ہم نے سن لیا۔ اگر ہم چاہیں تو ہم بھی ایسا ہی کہہ سکتے ہیں۔ یہ تو صرف پچھلوں کے قصے ہیں۔

اس آیت کے شان نزول میں کہا جاتا ہے کہ قدیم مکہ میں ایک شخص نضر بن حارث تھا۔ وہ تجارتی مقصد سے فارس جاتا تھا۔ وہاں بادشاہوں کے قصے اور رستم اور اسفندیار کی داستانیں سنتا اور واپس آکر مکہ والوں کو سناتا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت ہوئی تو آپ لوگوں کو قرآن پڑھ کر سنانے لگے۔ نضر بن حارث قرآن کا مذاق اڑاتا اور فارس کے بادشاہوں اور فوجی سرداروں کے مبالغہ آمیز قصے سنا کر لوگوں سے کہتا کہ بتاؤ کہ محمد کا قصہ زیادہ اچھا ہے یا میرا (ایھما احسن قصصاً، انا او محمد) نضر بن حارث بدر کی جنگ میں گرفتار ہوا اور مارا گیا (تفسیر ابن کثیر، جلد ۲)

آج مکہ میں کوئی شخص یہ جملہ نہیں کہہ سکتا۔ پھر چودہ سو برس پہلے مکہ کے ایک شخص کو یہ جملہ کہنے کی جرأت کیسے ہوئی۔ اس کی وجہ زمانہ کا فرق ہے۔ چودہ سو سال پہلے قرآن اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت دونوں نزاعی (Controversial) حیثیت رکھتے تھے۔ مگر آج لمبی تاریخ کے نتیجہ میں قرآن کا کتاب الٰہی ہونا اور محمد صلے اللہ علیہ وسلم کا پیغمبر خدا ہونا تسلیم شدہ واقعہ (Established fact) بن چکا ہے۔

یہی وہ فرق ہے جس کی بنا پر پہلے ایک شخص کو مذکورہ بات کہنے کی جرأت ہوتی تھی اور آج کسی کو اس قسم کے الفاظ بولنے کی جرأت نہیں ہوتی۔

صحابہ کا درجہ اس لئے بڑا ہے کہ انھوں نے جوہر شناسی کی سطح پر قرآن کو اور پیغمبر کو پہچانا۔ انہوں نے اس وقت اپنے آپ کو اسلام سے وابستہ کیا جب کہ اسلام کی عظمتوں کا گنبد نہیں بنا تھا۔ آج جو لوگ پرجوش اسلامی تقریریں کرتے ہیں وہ صرف گنبد شناسی کا کمال دکھاتے ہیں۔ اگرچہ بطور خود وہ سمجھتے ہیں کہ وہ حقیقت شناسی کا ثبوت دے رہے ہیں۔

دو قسم کے انسان

مکی دور کا واقعہ ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قبیلہ بنو عامر بن صعصعہ کے پاس گیے۔ ان کو اللہ کی طرف بلایا اور ان سے کہا کہ دعوت حق کے اس کام میں میری مدد کرو۔ ان میں سے ایک شخص اٹھا۔ اس کا نام بیحرہ بن فراس تھا۔ اس نے کہا کہ اگر ہم اس معاملہ میں آپ کا ساتھ دیں پھر اللہ آپ کو آپ کے مخالفین پر غالب کر دے تو کیا آپ کے بعد اقتدار (امر) میں ہمارا حصہ ہوگا۔ آپ نے فرمایا اقتدار اللہ کا ہے وہ جسے چاہتا ہے اسے دیتا ہے۔ اس کے بعد روایت کے الفاظ یہ ہیں :

فقال له افنهدف نحورنا للعرب دونك فاذا اظهرك الله كان الامر لغيرنا؟ لاحاجة لنا بامرك فأبوا عليه۔

(سیرت ابن ہشام جزء ثانی صفحہ ۳۲)

اس نے آپ سے کہا کیا ہم آپ کی حمایت میں اپنے سینہ کو سارے عرب کا نشانہ بنائیں پھر جب اللہ آپ کو غلبہ دیدے تو اقتدار ہمارے سوا دوسرے کا ہو جائے۔ ہم کو آپ کے دین کی ضرورت نہیں۔ چنانچہ انھوں نے آپ کا ساتھ دینے سے انکار کر دیا۔

یہ ایک قسم کے انسان کی مثال تھی۔ اب دوسرے قسم کے انسان کی مثال لیجیے۔

مکی زندگی کے آخری زمانہ میں مدینہ کے کچھ لوگ آپ کے پاس آئے اور اسلام قبول کیا۔ لوگ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس جمع ہوئے تو ان میں کا ایک شخص اٹھا۔ یہ عباس بن عبادہ بن نضلہ انصاری تھے۔ انھوں نے کہا کہ اے قبیلہ خزرج کے لوگو کیا تم جانتے ہو کہ تم اس آدمی سے کس چیز پر بیعت کر رہے ہو۔ انھوں نے کہا ہاں۔ کہا کہ تم تمام سرخ و سفید کے خلاف جنگ پر بیعت کر رہے ہو۔ اس میں تمہارے اموال برباد ہوں گے اور تمہارے بہترین افراد قتل کیے جائیں گے :

قالوا فانا ناخذه على مصيبة الاموال وقتل الاشراف۔ فما لنا بذلك يا رسول الله ان نحن وَفَينا۔ قال الجنة۔ قالوا ابسط يدك فبسط يده فبايعوه۔

(الجزء الثانی، ۵۵)

انھوں نے کہا کہ پھر ہم ان کو اموال کی ہلاکت اور افراد کے قتل کے باوجود قبول کرتے ہیں۔ پھر اے خدا کے رسول ہمارے لیے کیا ہے اگر ہم اس کو پورا کر دیں آپ نے فرمایا جنت۔ انھوں نے کہا کہ ہاتھ بڑھائیے۔ آپ نے ہاتھ بڑھایا اور پھر انھوں نے بیعت کی۔

بدگمانی

حضرت عبد اللہ بن عمرو بن العاصؓ کہتے ہیں کہ وہ اس وقت موجود تھے جب کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے غزوۂ حنین کے بعد مال غنیمت کو لوگوں کے درمیان تقسیم کیا۔ اس سلسلے کی ایک طویل روایت کا ایک حصہ یہ ہے :

جاء رجل من بنی تمیم یقال لہ ذوالخُویصِرۃ۔ فوقف علیہ وھو یعطی الناس۔ فقال یامحمد قد رأیت ماصنعت فی ھٰذا الیوم۔ فقال رسول اللّٰہ صلی اللہ علیہ وسلم، اجل فکیف رأیت۔ فقال لم اَرَاک عَدَلتَ۔

(سیرۃ ابن ہشام، الجزء الرابع، صفحہ ۱۴۴)

بنو تمیم کا ایک شخص آیا جس کا نام ذوالخُویصرہ تھا۔ وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس کھڑا ہو گیا۔ اور آپ اس وقت لوگوں کو دے رہے تھے۔ اس نے کہا کہ اے محمد، میں نے دیکھ لیا جو آپ نے آج کے دن کیا ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہاں، پھر تم نے کیا دیکھا۔ اس نے کہا کہ میں نے نہیں دیکھا کہ آپ نے انصاف کیا ہو۔

حضرت عبداللہ بن عباسؓ کہتے ہیں کہ عُیینہ بن حصن مدینہ آئے اور اپنے بھتیجے حُر بن قیس کے یہاں ٹھہرے۔ پھر وہ خلیفہ ثانی حضرت عمر فاروقؓ کے یہاں اجازت لے کر حاضر ہوئے۔ جب وہ آئے تو انھوں نے کہا :

ھی یا ابن الخطاب۔ فواللّٰہ ماتعطینا الجزل ولاتحکم فینا بالعدل۔

(ریاض الصالحین صفحہ ۱۱۳)

اے خطاب کے لڑکے، خدا کی قسم آپ نہ ہم کو کچھ دیتے ہیں اور نہ ہمارے درمیان انصاف کے ساتھ فیصلہ کرتے ہیں۔

مذکورہ دونوں الزام یقینی طور پر غلط تھے۔ پھر بھی دو معصوم ترین روحوں پر الزام لگانے کے لیے لوگوں نے الفاظ پا لیے۔ اس سے معلوم ہوا کہ اس دنیا میں کسی کے ملزم ثابت ہونے کے لیے یہ کافی نہیں کہ کچھ لوگ اس کے خلاف کچھ الفاظ پا لیں۔ لوگوں کو بہر حال اس قسم کے الفاظ ملتے رہیں گے کہ وہ جس کو بدنام کرنا چاہیں بدنام کریں۔ یہاں تک کہ قیامت کا زلزلہ آئے اور لوگوں سے ناحق کلام کرنے کی آزادی چھین لے۔

جھوٹا یقین

رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کو اپنے مخالفین کے ساتھ جو جنگیں پیش آئیں ان میں سے ایک جنگ وہ تھی جس کو جنگ احد کہا جاتا ہے۔

اس جنگ میں بعض وجوہ سے مسلمانوں کو شکست ہوئی۔ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم سخت زخمی ہو گئے۔ مسلمانوں کی فوج منتشر ہو گئی۔ روایات میں آتا ہے کہ جب مخالفین نے دیکھا کہ ان کی فتح مکمل ہو چکی ہے تو ان کے سردار ابوسفیان (جو اس وقت تک اسلام نہیں لائے تھے) ایک ٹیلہ پر چڑھے اور مسلمانوں کے مقابلہ میں اپنی فتح کا اعلان کرتے ہوئے بلند آواز سے کہا:

لنا عزیٰ و لا عزیٰ لکم — ہمارے پاس عزیٰ ہے اور تمہارے پاس کوئی عزیٰ نہیں۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے سنا تو صحابہ سے فرمایا کہ تم اس کا جواب اس طرح دو:

اللہ مولانا و لا مولیٰ لکم — اللہ ہمارا کارساز ہے اور تمہارا کوئی کارساز نہیں

عزیٰ قدیم عرب کا ایک بڑا بت تھا۔ عرب کے مشرکین کو اس بت پر زبردست یقین تھا۔ اگر انھیں یقین نہ ہوتا تو اس نازک موقع پر ان کے سردار کی زبان سے یہ جملہ نہ نکلتا کہ لنا عزیٰ ولا عزیٰ لکم۔

اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ ایک جھوٹی چیز پر بھی ایک آدمی کو کتنا گہرا یقین ہو سکتا ہے۔ عزیٰ محض ایک پتھر کا مجسمہ تھا۔ اس سے زیادہ وہ اور کچھ نہ تھا۔ مگر قدیم عرب کے مشرکین کو یقین تھا کہ اس عزیٰ کی وجہ سے ان کو مسلمانوں کے اوپر فتح حاصل ہوئی ہے۔ عزیٰ کی اہمیت ان کے نزدیک پیغمبر آخر الزماں اور آپ کے اصحاب کرام سے بھی زیادہ تھی۔ جو فخر آج مسلمانوں کو اپنے پیغمبر اور اصحاب پیغمبر پر ہے وہی فخر اس وقت کے مشرکین کو اپنے عزیٰ پر تھا۔

جھوٹا یقین ہر دور میں انسان کا سب سے بڑا مرض رہا ہے۔ وہ آج کے لوگوں میں بھی اتنا ہی عام ہے جتنا کہ وہ پچھلے زمانہ کے لوگوں میں عام تھا۔ سچائی کو اس دنیا میں صرف وہ شخص پاتا ہے جو جھوٹے یقین کے خول کو توڑ کر اس کے باہر آسکے۔

پھر بھی انھیں الفاظ مل گئے

مکہ کے سردار قبیلہ بنی ہاشم سے مطالبہ کرتے تھے کہ وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو ان کے حوالے کردیں تاکہ وہ آپ کو قتل کردیں۔ مگر بنو ہاشم کے سردار ابوطالب نے کہا: خدا کی قسم محمد کو ہم تمھارے حوالے نہیں کریں گے، یہاں تک کہ ہمارا ایک ایک شخص ہلاک ہو جائے۔ بالآخر نبوت کے ساتویں سال قریش نے بنو ہاشم کے خلاف بائیکاٹ کا معاہدہ لکھا جو کعبہ کے اندر آویزاں کیا گیا۔ اس کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور بنو ہاشم مجبور ہوئے کہ مکہ کے باہر ایک گھاٹی (شعب بنی المطلب) میں پناہ لیں

یہ بے حد سخت امتحان تھا۔ گھر کا اندوختہ شروع کے کچھ دنوں میں کام آتا رہا۔ اس کے بعد یہ نوبت آگئی کہ درخت کی جڑوں اور پتوں سے لوگ پیٹ بھرنے لگے۔ باہر کا قافلہ مکہ آتا تو آپ کے ساتھی بازار جاتے کہ کچھ کھانے پینے کا سامان خرید کر لائیں۔ مگر ابولہب نکل کر تاجروں سے کہتا کہ تم لوگ محمد کے ساتھیوں کو اتنی زیادہ قیمت بتاؤ کہ وہ خریدنے سے عاجز رہیں۔ چنانچہ وہ قیمتیں بہت بڑھا دیتے اور آپ کے ساتھی اس حال میں واپس آتے کہ ان کے بچے بھوک سے رو رہے ہوتے اور ان کا پیٹ بھرنے کے لئے ان کے پاس کچھ نہ ہوتا۔

جب تین سال گزر گئے تو ایسا ہوا کہ دیمک کعبہ کے اندر داخل ہوئی اور مذکورہ ظالمانہ معاہدہ (صحیفہ) کو کھا گئی۔ اللہ کے نام کے سوا اس میں کچھ باقی نہ رہا۔ اللہ تعالیٰ نے بذریعہ وحی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اس کی خبر کردی۔ آپ نے ابوطالب سے اس کو بیان کیا۔ ابوطالب نے کہا، کیا آپ کے رب نے آپ کو اس سے باخبر کیا ہے۔ آپ نے فرمایا۔ ہاں۔ اس کے بعد ابوطالب قریش کے پاس گئے اور ان سے کہا کہ میرے بھتیجے نے مجھے بتایا ہے، اور وہ کبھی جھوٹ نہیں بولتا، کہ تمھارے صحیفہ پر خدا نے دیمک مسلط کردی اور وہ اس کی تمام ظلم وجور کی دفعات کو کھا گئی، اب اس میں صرف خدا کا نام باقی رہ گیا ہے، اس لئے تم لوگ کعبہ کا دروازہ کھول کر اس صحیفہ کو دیکھو۔ اگر یہ بات صحیح ہو تو تم کو چاہئے کہ تم اپنے ظلم سے باز آجاؤ۔

قریش کے سردار اس پر راضی ہو گئے۔ انھوں نے کعبہ کا دروازہ کھول کر صحیفہ نکالا تو واقعۃً وہ خبر بالکل صحیح تھی جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے انھیں دی تھی، مگر اس کے باوجود وہ اپنے ظلم اور سرکشی سے باز نہ آئے اور ابوطالب سے کہا: یہ تمھارے بھتیجے کا جادو ہے (ھٰذا سحر ابن اخیک)

جھوٹی مخالفت

قدیم مکہ میں رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے دشمن آپ کے خلاف جو باتیں مشہور کرتے تھے، ان میں سے ایک بات یہ تھی کہ قرآن خدا کا کلام نہیں، وہ ایک بناوٹی کلام ہے۔ قرآن میں بتایا گیا ہے کہ انکار کرنے والے لوگ کہتے ہیں کہ یہ صرف ایک جھوٹ ہے جس کو انھوں نے گھڑ لیا ہے، اور کچھ دوسرے لوگوں نے اس میں ان کی مدد کی ہے۔ پس یہ لوگ ظلم اور جھوٹ کے مرتکب ہوئے (الفرقان ۴)

دوسری جگہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ ہم کو معلوم ہے کہ وہ لوگ کہتے ہیں کہ (محمد کو یہ کلام) ایک آدمی سکھاتا ہے۔ جس شخص کی طرف وہ منسوب کرتے ہیں اس کی زبان عجمی ہے اور یہ قرآن صاف عربی زبان میں ہے۔ (النحل ۱۰۳)

روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ مکہ میں کچھ افراد تھے جو یہودیوں کی زبان جانتے تھے، مثلاً ابوفکیہہ، عداس، جبر۔ وہ تورات وغیرہ پڑھتے تھے۔ چونکہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم اپنی تبلیغی سرگرمیوں کے تحت ان سے بھی ملتے تھے، اس کو مخالفین نے شوشہ بنالیا:

انّ النّبیّ صلّی اللہ علیہ وسلّم رُبّما جلس الیھم لیعلّمھم ممّا علّمہ اللہ۔۔۔۔ فقال الکفّار انّما یتعلّم محمّد منہ

(تفسیر القرطبی ۱۰/ ۱۷۸)

رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کبھی کبھی ان لوگوں کے پاس بیٹھتے تھے تاکہ ان کو اس بات کی تعلیم دیں جس کی تعلیم اللہ نے آپ کو دی ہے۔ پس کافروں نے کہا کہ محمد تو انھیں لوگوں سے سیکھتے ہیں۔

مذکورہ افراد مکہ کے معمولی افراد تھے۔ ان میں سے کوئی غلام تھا اور کوئی لوہار تھا۔ مگر رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے مخالفین چوں کہ آپ کی شخصیت کو اور آپ کے کلام کو بالکل بے وزن سمجھتے تھے، اس لیے انھوں نے آپ کو انھیں معمولی لوگوں سے منسوب کر دیا کہ یہی افراد ہیں جو آپ کا ذریعۂ معلومات ہیں۔

مزید یہ کہ انھوں نے سکھانے کے معاملہ کو سیکھنے کا معاملہ بنا دیا۔ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم ان کے پاس اس لیے بیٹھتے تھے کہ ان کو تعلیم دیں۔ مگر بات کو بدل کر انھوں نے یہ کہہ دیا کہ آپ خود ان سے تعلیم حاصل کرتے ہیں۔

مخالفت کس طرح آدمی کو اندھا اور بہرا بنا دیتی ہے۔ جب آدمی کسی کے خلاف عناد میں مبتلا ہو جائے تو کھلی حقیقتیں بھی اس کو نظر نہیں آتیں۔ وہ سیدھی بات کو ٹیڑھے معنی پہنا دیتا ہے۔

رسولؐ کو ماننا

احد کی جنگ میں جب ایک غلطی سے مسلمانوں کو شکست ہوئی تو لوگ ادھر ادھر منتشر ہوگئے۔ تاہم رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم انتہائی عزم وتوکل کے ساتھ اپنی جگہ قائم رہے۔ آپ کے ساتھ پندرہ افراد بھی تیروں اور تلواروں کی بارش میں جمے رہے۔ اس وقت ایک مشرک عبداللہ بن قمیہ نے آپ کی طرف پتھر پھینکے۔ یہ دیکھ کر آپ کے ساتھیوں میں سے حضرت مصعب بن عمیر اس کی طرف بڑھے۔ دونوں میں جنگ ہوئی۔ عبد اللہ بن قمیہ نے حضرت مصعب بن عمیر کو قتل کر دیا۔ اس نے سمجھا کہ یہ خود رسول اللہ تھے۔ اور اس نے آپ کو اپنی تلوار سے ہلاک کر دیا ہے۔ اس کے بعد وہ یہ آواز لگاتا ہوا واپس ہوا: الا ان محمدا قد قتل الا ان محمدا قد قتل (سنو، محمد قتل کر دئے گئے۔ سنو، محمد قتل کر دئے گئے)

یہ خبر پھیلی تو مسلمانوں میں سے جو لوگ ادھر ادھر بکھر گئے تھے وہ بھی اس سے متاثر ہوئے۔ صحیح بخاری میں حضرت عبداللہ بن عباس کی ایک طویل روایت ہے۔ اس میں یہ الفاظ آئے ہیں؛

قال اناس من اھل النفاق ان کان محمد قد قتل فالحقوا بدینکم الاول۔ فقال انس بن النضر یا قوم ان کان قد قتل محمد فان رب محمد لم یقتل (التفسیر المظھری)

کچھ اہل نفاق نے کہا کہ اگر محمد قتل کر دئے گئے ہیں تو اب اپنے پہلے دین میں شامل ہو جاؤ۔ انس بن نضر نے کہا اے لوگو، اگر محمد قتل کر دئے گئے ہیں تو محمد کا رب تو قتل نہیں ہوا۔

ایک روایت کے مطابق ایک انصاری نے کہا: ان کان محمد قتل فقد بلغ فقاتلوا عن دینکم (اگر محمد قتل کر دئے گئے ہیں تو وہ اپنا دین پہنچا چکے تو اب تم اس دین کے لئے لڑو، تفسیر ابن کثیر) اس پر قرآن میں یہ آیت اتری کہ محمد تو صرف ایک رسول ہیں۔ ان سے پہلے بہت سے رسول گزر چکے ہیں۔ پھر کیا اگر وہ مر جائیں یا قتل کر دئے جائیں تو تم الٹے پاؤں پھر جاؤ گے۔ اور جو شخص الٹے پاؤں پھر جائے تو وہ ہرگز اللہ کا کچھ نہیں بگاڑے گا۔ اور اللہ شکر گزاروں کو بدلہ عطا فرمائے گا (آل عمران ۱۴۴)

کچھ لوگ وہ ہیں جو محمد کو اس حیثیت سے پہچانتے ہیں کہ انھوں نے دنیا کو فتح کیا۔ کچھ لوگ وہ ہیں جو آپ کو اس حیثیت سے پہچانتے ہیں کہ آپ نے لوگوں کو اللہ کی طرف بلایا۔ حقیقی مومن وہ ہے جو محمد کو داعی کے روپ میں پہچانے ——— جو لوگ آپ کو فاتح کے روپ میں پہچانیں ان کی پہچان صرف مورخ کی پہچان ہے نہ کہ حقیقی معنوں میں مومن کی پہچان۔

دین فطرت

ایک مسلمان جون پور سے اعظم گڑھ کے لیے روانہ ہوئے۔ ٹیکسی میں ایک ہندو بھائی بھی تھے۔ ابتدائی تعارف کے بعد انھوں نے کہا: آپ لوگ تو پہلے ہندو تھے، پھر آپ اپنے پرانے دھرم پر کیوں نہیں آجاتے۔ مسلمان نے کہا کہ اسلام نے ہم کو توحید دی ہے، آپ ہمیں کیا دیں گے۔ اگر آپ ہمیں مورتی پوجا دیں، تو اس کو تو آپ خود ہی چھوڑ رہے ہیں۔ اسلام نے ہمیں سماجی برابری دی ہے۔ اس کے بدلے آپ ہمیں کیا دیں گے۔ اگر آپ ہم کو ذات پات اور چھوا چھوت دیں، تو اس سے بھی آپ لوگ خود ہی برأت کر رہے ہیں۔ ہندو بھائی یہ باتیں سن کر خاموش ہو گیے۔

ایک مسلمان اپنے گھر کے سامنے بیٹھا ہوا تھا۔ اتنے میں ایک شخص وہاں آیا۔ اس نے کہا کہ میں گورکھپور کا ایک برہمن ہوں۔ میرے دل میں کئی سال سے ایک کھٹک ہے۔ میں نے بہت سے پنڈتوں اور پادریوں سے پوچھا۔ مگر مجھے اطمینان نہ ہوسکا۔ میں اس تلاش میں ہوں کہ آدمی کے لیے نجات کا ذریعہ کیا ہے۔ مسلمان نے کہا کہ نجات کا راستہ ہے —— خدا کو ایک ماننا، آخری رسول محمد صلے اللہ علیہ وسلم کو پیغمبر تسلیم کرنا، اور ان کے بتائے ہوئے راستہ کے مطابق آخرت کی فکر کرنا۔ برہمن نے کہا کہ میں اسلام کی ان تینوں ہی باتوں کو مانتا ہوں۔

یہ باتیں ہو رہی تھیں کہ اتنے میں مغرب کی اذان ہوگئی۔ اللہ اکبر، اللہ اکبر کی آواز فضا میں گونجنے لگی۔ مسلمان نے کہا کہ چلئے، مسجد میں چل کر نماز پڑھ لیں۔ انھوں نے کہا کہ میں کیسے نماز پڑھوں گا، میں تو ہندو ہوں۔ مسلمان نے کہا کہ جب آپ اسلام کی ان تین بنیادی باتوں (توحید، رسالت، آخرت) کا اقرار کرتے ہیں تو آپ مسلم ہیں۔ وہ راضی ہو گیے اور وضو کر کے مسلمان کے ساتھ مغرب کی نماز میں شریک ہو گیے (دلی جمعیۃ، ۱۵ اپریل ۱۹۸۹)

اس قسم کے بے شمار واقعات ہیں جو یہ بتاتے ہیں کہ اسلام کس قدر سادہ مذہب ہے۔ اسلام کی یہ سادگی ہی اسلام کی سب سے بڑی طاقت ہے۔ اسلام اتنا زیادہ سادہ مذہب ہے کہ ہر مسلمان اس کو سمجھ سکتا ہے اور دوسروں کے اوپر اس کی تبلیغ کر سکتا ہے۔ وہ اتنا فطری مذہب

ہے کہ کوئی بھی شخص جو اس کو خالی الذہن ہو کر سنے، وہ فوراً اس کے دل کو اپیل کرے گا۔

اسلام کے پھیلنے میں رکاوٹ صرف اس وقت ہوتی ہے جب کہ اسلام کو سننے اور سمجھنے کے لیے معتدل فضا باقی نہ رہے۔ حقیقت یہ ہے کہ مسلمانوں اور غیر مسلموں کے درمیان اگر اجنبیت حائل نہ ہو اور ان کے درمیان تناؤ کا ماحول ختم ہو جائے تو منظم تبلیغی کوششوں کے بغیر اپنے آپ تبلیغ ہونے لگے۔ دونوں فرقوں کے درمیان روزانہ کا عام میل جول ہی اسلام کی اشاعت کا ذریعہ بن جائے۔

دوسرے مذاہب جو آج دنیا میں پائے جاتے ہیں، ان میں عقائد اور عبادات کا نظام اتنا پیچیدہ ہے کہ صرف اعلیٰ تربیت یافتہ (پنڈت اور پادری) ہی اس کی تبلیغ کر سکتے ہیں۔ اسلام کا معاملہ اس سے بالکل مختلف ہے۔ اسلام ایک انتہائی سادہ اور کامل طور پر ایک فطری مذہب ہے۔ اس لیے ہر مسلمان اس کی تبلیغ کر سکتا ہے، ہر مسلمان اس کی اشاعت کا ذریعہ بن سکتا ہے۔

ہزاروں لوگ جو ہر روز دنیا کے مختلف حصوں میں اسلام قبول کرتے رہتے ہیں، ان کا معاملہ زیادہ تر یہی ہے، وہ کسی تربیت یافتہ مبلّغ کی تبلیغ سے اسلام میں داخل نہیں ہوتے۔ بلکہ بیشتر حالات میں ایسا ہوتا ہے کہ مسلمانوں سے میل جول کے درمیان انھیں اسلام کی کسی تعلیم کا تجربہ ہوتا ہے۔ اس سے ان کے اندر تلاش کا جذبہ جاگتا ہے۔ اس کے بعد وہ قرآن یا دوسری اسلامی کتابیں پڑھتے ہیں۔ یہاں تک کہ مزید متاثر ہو کر اسلام قبول کر لیتے ہیں۔ اس بات کو سمجھنے کے لیے یہاں ایک واقعہ نقل کیا جاتا ہے۔

روسنا توری (Rosanna Da La Torre) ایک امریکی خاتون ہیں۔ انھوں نے اسلام قبول کر لیا ہے۔ پہلے وہ ایک فیشن پسند لڑکی تھیں۔ مگر اب وہ اسلامی طریقہ کے مطابق باحجاب زندگی گزار رہی ہیں۔ ان کے قبول اسلام کے بارہ میں ان کا ایک خط امریکی مسلمانوں کے جریدہ اسلامک ہورائزن (*Islamic Horizons*) کے شمارہ دسمبر ۱۹۸۸ میں شائع ہوا ہے۔

وہ لکھتی ہیں کہ میں کیلی فورنیا کی ایک کیتھولک خاندان میں پیدا ہوئی۔ میرے والدین بچپن سے مجھ کو چرچ لے جاتے تھے۔ وہاں میں دیکھتی تھی کہ لوگ مسیح کے اسٹیچو کے آگے جھک رہے ہیں۔ مگر میرا دل کبھی اس پر راضی نہیں ہوتا تھا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ میں یہ سمجھ نہیں پائی تھی کہ اسٹیچو کے

اندر خدا ہے :

I did not associate deity to a statue.

اس بنا پر میرے اور میرے خاندان کے درمیان ایک کشمکش جاری رہتی تھی۔ تاہم میرا تلاش کا جذبہ ختم نہیں ہوا۔ میں نے مسیحیت اور دوسرے مذہبوں کا مطالعہ شروع کیا۔ مگر مجھے اطمینان حاصل نہ ہو سکا۔ اس وقت تک مجھے اسلام کے بارے میں کچھ معلوم نہ تھا۔ اس کے بعد ایک چھوٹا سا واقعہ ہوا۔

ابوظبی (عرب امارات) کی ایک مسلم خاتون علاج کے لیے لاس انجلیز آئیں۔ اس دوران میں ان سے میری ملاقات ہوئی۔ جب وہ واپس جانے لگیں تو انھوں نے دعوت دی کہ میں بھی ان کے ساتھ کچھ دنوں کے لیے ابوظبی چلوں۔ اس طرح میں امریکہ سے ابوظبی پہونچی۔ وہاں ایک روز میرے کان میں ایک نئی آواز آئی۔ پوچھنے پر معلوم ہوا کہ یہ "اذان" ہے۔

مؤذن بلند آواز سے پکار رہا تھا : اللہ سب سے بڑا ہے، اللہ سب سے بڑا ہے (اللہ اکبر اللہ اکبر) اس نئی آواز نے خاتون کو اپنی طرف کھینچ لیا۔ چرچ کے اندر انھوں نے دیکھا تھا کہ خدا ایک محدود اسٹیچو کے روپ میں رکھا ہوا ہے۔ دوسرے لفظوں میں یہ کہ مسیحی چرچ یہ کہہ رہا تھا کہ خدا چھوٹا ہے۔ یہاں یہ اعلان سنائی دیا کہ خدا بڑا ہے۔ امریکی خاتون کو چرچ کی بات غیر معقول اور خلاف واقعہ محسوس ہو رہی تھی، اس کے مقابلہ میں مسجد کی بات پوری طرح معقول اور مطابق واقعہ نظر آئی۔ چرچ کا پیغام انھیں متاثر نہ کر سکا تھا، مگر مسجد کا پیغام ان کی فطرت کی آواز بن کر ان کے سینے میں اتر گیا۔

اس تاثر کے تحت جب مؤذن نے پکارتے ہوئے کہا کہ آؤ فلاح کی طرف (حی علی الفلاح) تو امریکی خاتون کو ایسا محسوس ہوا جیسے خدا ان سے مخاطب ہو کر یہ کہہ رہا ہو کہ دوستا، میری طرف آؤ، کیوں کہ میں ہی وہ سچائی ہوں جس کی تمہیں تلاش ہے۔ وہ کہتی ہیں کہ اذان کا پیغام نہایت طاقت ور تھا، وہ بجلی کی کوند کی طرح میرے دل پر اثر کر گیا۔ یہی وہ چیز ہے جس نے ابتداءً میرے اندر اسلام سے دلچسپی پیدا کر دی :

The message of the Adhan was powerful. It hit my heart like a bolt of lightening. This is what sparked my interest in Islam. (p. 4)

خاتون موصوف لکھتی ہیں کہ اس کے بعد میں نے اسلامی کتابوں کو پڑھنا شروع کیا۔ اسلامی کانفرنسوں میں شرکت کی۔ اور قرآن کا مطالعہ کیا۔ الحمدللہ، اللہ نے مجھے اسلام کی نعمت بخشی۔ میری پیاس آخری طور پر بجھ گئی۔ زندگی کے بارے میں میرا پورا نقطۂ نظر بدل گیا۔ اب مجھے پوری طرح سکون اور خوشی حاصل ہے۔

اسلام اپنی ذات میں تبلیغ ہے۔ وہ خود بخود لوگوں کو اپنی طرف کھینچتا ہے۔ اگر مسلمان یک طرفہ صبر کے ذریعہ نفرت اور تناؤ کی فضا کو ختم کر دیں تو کسی رسمی تبلیغ کے بغیر اسلام لوگوں کے اندر نفوذ کرنا شروع کر دے گا۔

دعوتی تسخیر

حال میں فرانس کے ایک مشہور آرٹسٹ نے اسلام قبول کر لیا ہے۔ اس کا سابقہ نام برنارڈجو ہے۔ اور موجودہ اسلامی نام عبدالعزیز ہے۔ انھوں نے بتایا کہ مجھے اپنے فن سے عشق تھا اور اس کے لیے میں دنیا کے مختلف ملکوں میں کثرت سے سفر کرتا تھا۔ اس سلسلہ میں میں مصر گیا اور قاہرہ اور اسکندریہ میں چند روز قیام کیا۔

ایک روز جب کہ میں قاہرہ کی سڑکوں پر چل رہا تھا، میرے کان میں ایک پرکشش آواز آئی۔ یہ اذان کی آواز تھی جو مسجد کے میناروں سے بلند ہو رہی تھی۔ اس قسم کی آواز میں نے پہلی بار سنی تھی۔ مجھے مزید جستجو ہوئی۔ جب مجھے معلوم ہوا کہ یہ نماز کی پکار ہے تو میں مسجد میں گیا اور لوگوں کو صف بستہ نماز پڑھتے ہوئے دیکھا۔ اذان کی آواز اور نماز کے مناظر نے مجھے غیر معمولی طور پر متاثر کیا۔ میں فرانس واپس آیا تو میں نے اسلامی لٹریچر تلاش کر کے اسلام کا مطالعہ شروع کر دیا۔ میں نے قرآن کی تلاوت کے کیسٹ بھی سنے۔ ان عربی کیسٹوں کو اگرچہ میں سمجھتا نہ تھا، مگر ان کا سننا مجھے اچھا لگتا تھا، اس لیے میں ان کو سنتا رہا۔

اس کے بعد میں دوبارہ مصر گیا۔ وہاں میں نے الازہر کے علماء کے سامنے اسلام قبول کر لیا۔ اب میں محسوس کرتا ہوں کہ سابق "برنارڈجو" اور موجودہ "عبدالعزیز" میں بہت زیادہ فرق ہے۔ اسلامی عقیدہ نے میرے طریقہ کو بدل دیا ہے۔ تاریکی کے بعد اب میں روشنی میں آگیا ہوں۔ مجھے اپنے اندر ایک ایسا سکون محسوس ہو رہا ہے جس سے میں اس سے پہلے کبھی آشنا نہ تھا۔ اسلام میری روح اور میرے جسم میں خون کی طرح رواں دواں ہے (صفحہ ۶)

یہ کوئی ایک مثال نہیں۔ فرانس میں (اور اسی طرح دوسرے مغربی ملکوں میں) کثرت سے لوگ اسلام قبول کر رہے ہیں۔ خود فرانس میں پچھلے سالوں میں روجیہ جارودی، مائیکل شودکیوبنز اور موریس بجار وغیرہ جیسے بہت سے مشہور اور ممتاز لوگ اسلام میں داخل ہو چکے ہیں اور برابر داخل ہو رہے ہیں۔ ان واقعات کا ذکر کرتے ہوئے ریاض کے ہفت روزہ الدعوۃ (۲ جمادی الاولیٰ ۱۴۱۰ھ، ۳۰ نومبر ۱۹۸۹ء) نے لکھا ہے:

اگرچہ مستشرقین اور دوسرے مخالفین اسلام کو بدنام کرنے اور اس کی تصویر بگاڑنے کی کوشش میں لگے ہوئے ہیں، اس کے باوجود اسلام انسانوں کے زخموں کے لیے ایک شفا بخش مرہم کی طرح دنیا میں پھیل رہا ہے۔ صلیبی لڑائیاں اس کی عظمت کو توڑ نہ سکیں اور نہ مستشرقین کی تحریریں یا "آیات شیطانی" جیسی کتابیں لوگوں کو دینِ خدا میں فوج در فوج داخل ہونے سے روکنے والی ثابت ہوئیں۔

رغم كل محاولات الحاقدين من مستشرقين أو غيرهم والذين يحاولون النيل من الاسلام وتشويه صورته الآ انه ينتشر كالبلسم الشافي لجروح الانسان على الارض. فلا الحروب الصليبية كسرت شوكته ولا المستشرقين نالوا منه ولا الآيات الشيطانية حدت من دخول الناس في دين الله افواجًا.

یہ واقعات ظاہر کر رہے ہیں کہ مخالفین کی مخالفتوں سے گھبرانے یا ان پر شور و غل کرنے کی کوئی ضرورت نہیں۔ مسلمانوں کو چاہیے کہ وہ ہمیشہ اسلام کی اپنی تسخیری طاقت پر اعتماد رکھیں، وہ دوسروں کی مخالفانہ کارروائیوں کو کوئی اہمیت نہ دیں۔

تاریخ نے بار بار یہ ثابت کیا ہے کہ اسلام خود اپنی ذات میں ایک طاقت ہے۔ اس کی یہ طاقت نہ سیاست کے خاتمہ سے فنا ہوتی اور نہ دوسروں کی سازشوں سے۔ اسلام ہر حال میں خود اپنی فکری اور نظریاتی طاقت کے بل پر پھیلتا ہے۔ حتی کہ مسلمانوں کا اخلاقی یا قومی زوال بھی اس کے اشاعتی عمل کو روکنے والا نہیں۔

واقعات بتاتے ہیں کہ مسلمانوں کے زوال کے زمانہ میں اسلام نے انتہائی تیزی کے ساتھ لوگوں کے دلوں کو مسخر کیا ہے۔ اس نے مسلمانوں کے بگاڑ کے زمانہ میں بھی اپنی پیش قدمی برابر جاری رکھی ہے۔ ایسی حالت میں مایوسی یا فریاد کی کیا ضرورت۔

حوصلہ مندی

سرسی وی رمن (۱۹۷۰ - ۱۸۸۸) ایک مشہور ہندستانی سائنس داں ہیں۔ انھوں نے روشنی کی سائنس میں ایک نیا اصول دریافت کیا جو انھیں کے نام پر رمن ایفکٹ (Raman Effect) کہلاتا ہے۔ اسی دریافت کی بنا پر انھیں ۱۹۳۰ میں فزکس کا نوبیل انعام دیا گیا۔

رمن تمل ناڈو کے ایک گاؤں میں پیدا ہوئے۔ انھوں نے انتہائی محنت کے ساتھ پڑھا۔ یہاں تک کہ بی ایس سی اور ایم ایس سی میں انھوں نے مدراس یونیورسٹی میں ٹاپ کیا۔ وہ نہایت حوصلہ مند آدمی تھے، انھوں نے کلکتہ یونیورسٹی کے سابق وائس چانسلر سر آسوتوش مکرجی کے سامنے یہ عہد کیا کہ میں نوبیل انعام کو نہر سوئز کے مشرق میں لے آؤں گا:

I will bring the Nobel prize east of the Suez.

اس عہد کو پورا کرنے کے لیے انھوں نے بے پناہ محنت شروع کی۔ تاہم ریسرچ کی آسانیاں انھیں حاصل نہ تھیں۔ معاشی ضرورت کے تحت انھوں نے کلکتہ میں ایک سرکاری ملازمت کرلی تھی۔ ایک روز وہ ٹرام کے ذریعہ بَو بازار (کلکتہ) سے گزر رہے تھے۔ انھوں نے دیکھا کہ ایک عمارت پر حسب ذیل الفاظ کا ایک بورڈ لگا ہوا ہے:

The Indian Association for the Cultivision of Science

یہ بورڈ دیکھ کر وہ چلتی ٹرام سے کود پڑے۔ اس ادارہ میں جا کر معلومات کیں۔ پتہ چلا کہ یہاں ریسرچ کی سہولتیں موجود ہیں۔ اس کے بعد وہ صبح سویرے وہاں پہونچ جاتے اور آفس کے وقت تک مسلسل اپنے تحقیق اور تجربے میں لگے رہتے۔ اسی طرح شام کو آفس سے چھٹی پاتے ہی دوبارہ وہاں پہونچ جاتے اور رات تک وہاں مشغول رہتے۔ اس طرح پندرہ سال کی مسلسل محنت سے انھوں نے وہ سائنسی قانون دریافت کیا جس پر انھیں دنیا کا معزز ترین علمی انعام (نوبیل پرائز) دیا گیا۔

رمن کو یہ دھن تھی کہ وہ نوبیل انعام کو سوئز کے مشرق میں لے آئیں اور وہ اس کو لے آئے۔ مگر آج خدا کے بندوں میں کوئی نہیں جو اس لیے تڑپ اٹھا ہو کہ وہ خدا کے دین کو سوئز کے مغرب میں لے جائے گا۔ خدا کا دین "سوئز" کو پار کرنے کے لیے آج بھی کسی حوصلہ مند کا انتظار کر رہا ہے۔

سابق شاہ روس

ولادیمیر اول (Vladimir I) ۹۵۶ء میں پیدا ہوا، اور ۱۰۱۵ء میں اس کی وفات ہوئی۔ وہ روس کا پہلا عیسائی بادشاہ ہے۔ وہ ابتداءً بت پرست تھا۔ اس نے عیسائی مذہب قبول کرلیا۔ اس کے بعد اس نے روسی باشندوں کو عیسائی بنانا شروع کیا۔ یہاں تک کہ ان کی اکثریت نے عیسائی مذہب اختیار کرلیا۔ تمام بُت دریاؤں میں پھینک دیئے گئے۔

گیارھویں صدی عیسوی کے ایک مسیحی راہب یعقوب (Jacob) نے اس سلسلہ میں جو تفصیلات بیان کی ہیں وہ بہت سبق آموز ہیں۔ اس نے لکھا ہے کہ شاہ روس ولادیمیر کا یقین اپنے آبائی مذہب (بت پرستی) سے اٹھ گیا۔ اس کے بعد اس نے تحقیق کے لیے یہودی، عیسائی اور اسلامی علماء کو بلایا۔ اور ہر ایک سے اس کے مذہب کے بارہ میں مفصل گفتگو کی (انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا، ۱۹۸۴، تذکرہ ولادیمیر)

یعقوب کے بیان کے مطابق یہودی علماء نے کہا کہ ہمارا خدا ہم سے ناراض ہے۔ اس لیے ہم کو نہیں معلوم کہ ہمارا مقام زمین میں ہے یا آسمان میں۔ ولادیمیر نے کہا کہ مجھے ایسے مذہب کی ضرورت نہیں۔

مسلم علماء کی زبان سے اسلام کی تعلیمات سن کر اس کو اسلام سے دلچسپی ہوئی۔ حتیٰ کہ وہ اسلام قبول کرنے پر آمادہ ہوگیا۔ مگر اس نے کہا کہ میں شراب کا بہت زیادہ عادی ہوں، میں اور سب کچھ کرنے کے لیے تیار ہوں مگر میں شراب کو نہیں چھوڑ سکتا۔ مسلم علماء نے کہا کہ ہمارے مذہب میں شراب حرام ہے اس لیے اگر تم اسلام قبول کرتے ہو تو تم کو شراب بھی لازماً چھوڑنی پڑے گی۔ اس نے علماء سے بہت زیادہ کہا کہ شراب کے معاملہ میں اسے رخصت دیدی جائے۔ مگر علماء راضی نہیں ہوئے۔ چنانچہ بات ختم ہوگئی اور شاہ روس اسلام قبول کرنے سے باز رہا۔

اس کے بعد شاہ روس ولادیمیر نے عیسائی مذہب کے لوگوں سے گفتگو کی۔ عیسائی عالموں نے زیادہ حکمت اور دانش مندی کا ثبوت دیا وہ اگرچہ اپنے مذہب اور عقائد کے معاملہ میں بادشاہ کو زیادہ مطمئن نہ کرسکے۔ مگر انھوں نے شراب کے معاملہ میں بادشاہ کو رخصت دے دی۔

مسیحیت پر اصولی اعتبار سے مطمئن نہ ہونے کے باوجود عملی اعتبار سے اس نے اس کو پسند کرلیا۔ چنانچہ گفتگو کے آخر میں شاہ روس نے مسیحی مذہب کو اختیار کرلیا۔ پروفیسر رابرٹس کے الفاظ میں :

It was a turning-point in Russian history and culture.
J.M. Roberts, *The Pelican History of the World.*
Penguin Books Ltd., 1980, p. 355.

یہ واقعہ روس کے تاریخ اور کلچر میں ایک نقطۂ انقلاب بن گیا۔ ایک ملک جس کا مستقبل اسلام کی طرف جاسکتا تھا، اس کا مستقبل مسیحیت کی سمت میں چلا گیا۔

جن علماء نے سابق شاہ روس سے گفتگو کی، ان کو اسلام کا ایک مسئلہ معلوم تھا، مگر ان کو اسلام کا دوسرا مسئلہ معلوم نہ تھا۔ وہ حرام وحلال کے قانونی مسئلہ کو جانتے تھے مگر وہ حکمت دعوت کے زیادہ گہرے مسئلہ کو نہیں جانتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ انھوں نے وہ نادانی کی جو اوپر کے واقعہ میں نظر آتی ہے۔

اسلام میں بلاشبہ شراب کو حرام کیا گیا ہے۔ مگر اسی کے ساتھ یہ بھی ایک واقعہ ہے کہ شراب اول روز سے حرام نہ تھی۔ مکہ میں جو لوگ مسلمان ہوئے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان سے توحید اور رسالت کی بیعت لیتے تھے مگر شراب چھوڑنے کا حکم نہیں دیتے تھے۔ چنانچہ مکہ کے اہل ایمان میں ایسے لوگ شامل تھے جو اسلام کے باوجود شراب پیتے رہے۔ انھوں نے بعد کو اس وقت شراب پینا چھوڑا جب کہ وہ ہجرت کرکے مدینہ آئے اور شراب کے بارہ میں آخری حکم نازل ہوگیا۔

اس سے واضح طور پر معلوم ہوتا ہے کہ دعوت و تبلیغ کا آغاز شراب کا حکم بیان کرنے سے نہیں ہوتا اور نہ یہ ضروری ہے کہ ایمان لانے کے لیے ہر حال میں ترک شراب کی شرط لگائی جائے۔ ترک شراب اگر پہلے مرحلہ میں ممکن نظر نہ آئے تو اس کو دوسرے مرحلہ کے لیے موخر کیا جاسکتا ہے۔

یہاں ایک شخص یہ کہہ سکتا ہے کہ شراب کے بارے میں رخصت اس وقت تک تھی جب تک اس کے بارے میں واضح حکم قرآن میں نہیں آیا تھا۔ اب جب کہ شراب کی حرمت کا واضح حکم آچکا ہے تو اب یہ ممکن نہیں ہے کہ ایک حرام کی ہوئی چیز کے بارے میں کسی کو رخصت دی جائے مگر یہ استدلال صحیح نہیں۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت سے یہ ثابت ہے کہ آپ نے دعوتی مصالح کے تحت بعض احکام میں لوگوں کے ساتھ وقتی طور پر نرمی اور رخصت کا طریقہ اختیار فرمایا۔ اس کی ایک واضح مثال قبیلۂ ثقیف کا معاملہ ہے۔ قبیلۂ ثقیف (طائف) کا وفد رمضان ۹ھ میں مدینہ آیا اور اسلام قبول کیا۔ انھوں نے قبولِ اسلام کے لیے یہ شرط لگائی کہ وہ زکوٰۃ نہ دیں گے اور جہاد نہیں کریں گے۔ اس وقت زکوٰۃ اور جہاد کا حکم واضح طور پر قرآن میں آچکا تھا۔ اس کے باوجود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کی شرطوں کو منظور کر لیا، اور فرمایا کہ بعد کو وہ خود ہی اس پر بھی عمل کریں گے۔ اس سلسلہ میں ابوداؤد کی ایک روایت یہاں نقل کی جاتی ہے:

عن وهب، سألت جابراً عن شأن ثقيف اذ بايعت۔ قال: اشترطت على رسول الله صلى الله عليه وسلم ان لاصدقة عليها ولاجهاد، وانه سمع رسول الله صلى الله عليه وسلم يقول بعد ذالك: "سيتصدقون ويجاهدون اذا اسلموا۔"

سیرۃ ابن کثیر، جلد ۴، صفحہ ۵۶

وہب کہتے ہیں کہ میں نے حضرت جابر سے ثقیف کے معاملہ میں پوچھا جب کہ انھوں نے بیعت کی تھی۔ انھوں نے کہا کہ ثقیف نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ شرط لگائی کہ ان پر زکوٰۃ نہ ہوگی اور نہ ان پر جہاد ہوگا۔ اور یہ کہ انھوں نے اس کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ کہتے ہوئے سُنا: جب وہ اسلام قبول کر لیں گے تو آئندہ وہ زکوٰۃ بھی دیں گے اور جہاد بھی کریں گے۔

اسلام کے مستقل احکام وہی ہیں جو قرآن و حدیث میں مذکور ہیں۔ یہ احکام بلاشبہ کسی تفریق وتقسیم کے بغیر مطلوب ہیں۔ مگر مخصوص حالات میں کسی شخص کے ساتھ وقتی طور پر رخصت اور رعایت کا طریقہ اختیار کرنا بھی خود اسلام ہی کا تقاضا ہے۔

دعوت کے معاملہ میں خاص طور پر اس کا بہت زیادہ لحاظ کیا گیا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اسلام میں کسی شخص یا قوم کا داخلہ ایک تدریجی عمل ہے۔ حکمت دعوت اسی تدریج کو ملحوظ رکھنے کا دوسرا نام ہے۔ رسول اور اصحاب رسول نے اسی تدریج کی حکمت کو اختیار کر کے ایک عالم میں اسلام کو پھیلا دیا۔ بعد کے زمانہ میں جب مسلمان اس حکمت کو بھول گئے تو اسلام کی اشاعت کا کام بھی رک گیا۔

فرانس میں اسلام

اسلام فرانس میں تیزی سے بڑھ رہا ہے۔ پورے ملک میں کثرت سے مسجدیں بن رہی ہیں۔ فرانس کے وزیر داخلہ چارلس پاسکا نے اپنے عملہ کو ہدایت کی ہے کہ وہ اس نئے اور عجیب منظر پر ایک رپورٹ تیار کر کے انھیں دیں جس کو انھوں نے "ہزار مسجدوں کا فرانس" کہا ہے۔ پندرہ سال کے اندر فرانس میں مسجدوں کی تعداد ایک درجن سے ایک ہزار تک پہنچ گئی ہے۔

علم سیاست کے پروفیسر گلیز کپل کی ایک نئی کتاب شائع ہوئی ہے جس کا نام ہے "مضافاتِ اسلام"۔ اس میں انھوں نے انکشاف کیا ہے کہ اس مغربی ملک میں ایک "اسلامی فرانس" وجود میں آرہا ہے۔ اس کے مطابق، فرانس میں مسلمانوں کی تعداد تقریباً تین ملین ہے۔ ۳۲ سالہ پروفیسر کپل کا کہنا ہے کہ ابھی تک یہ بات غیر واضح ہے کہ فرانس کے مسلمان ایک روز یہاں کے قومی دھارے میں ضم ہوجائیں گے یا نہیں۔ اکثر مبصرین کا خیال ہے کہ فرانس کی سوسائٹی اور اس کا کلچر اتنا طاقتور ہے کہ مسلمان دھیرے دھیرے یہاں کی سوسائٹی میں ضم ہوجائیں گے۔ دوسرے لوگوں کا کہنا ہے کہ یہاں کے مسلمان اپنی شناخت کو محفوظ رکھیں گے اور کیتھولک، پروٹسٹنٹ یا یہود کی طرح ایک علحدہ فرقہ بن کر باقی رہیں گے۔

فرانسیسی مسلمانوں کی بہت بڑی اکثریت شمالی افریقہ کی سیاہ فام نسل سے تعلق رکھتی ہے جو یا تو مہاجر ہیں یا پاسپورٹ پر یہاں رہ رہے ہیں۔ کچھ ترک مسلمان ہیں۔ صرف مٹھی بھر ایسے لوگ ہیں جو اصلاً فرانسیسی ہیں اور مذہب تبدیل کر کے مسلمان بنے ہیں۔ فرانسیسی مسلمان زیادہ تر غریب طبقہ سے تعلق رکھتے ہیں۔ ان میں بہت سے ہیں جو بالکل جاہل ہیں۔

فرانس یورپ کا اہم ترین ملک ہے۔ فرانس جیسے ملک میں تین ملین مسلمانوں کا اجتماع انھیں مغربی دنیا میں اسلام کی دعوت واشاعت کا زبردست موقع دے رہا ہے۔ مگر دعوتی ذہن نہ ہونے کی وجہ سے ان کی ساری توجہ صرف اس پر لگی ہوئی ہے کہ اس مغربی ملک میں وہ اپنی گروہی شناخت کو باقی رکھ سکیں۔ دعوت و تبلیغ کا ذہن آدمی کے اندر آفاقیت پیدا کرتا ہے اور قومی شناخت کا ذہن صرف محدودیت۔

Islam in France

By Hanspeter Oschwald

PARIS :

Islam has made huge strides in France, with mosques spreading across the landscape and increasingly self-assured Muslims demanding recognition that this is now a partly Muslim country. Interior Minister Charles Pasqua has instructed his staff to prepare him a report on this strange new "France of the Thousand Mosques" detailing the influence of Islamic fundamentalists. The newspaper and broadcasting have also discovered the "Islamic French" thanks to a major new book by a specialist in Islamic studies and political science professor, Gilles Kepel.

The book, Islam's Suburbs surveys a Muslim community of about 3 million that has often been the target of racism. The numbers have not grown for 15 years, but Muslim consciousness has sharply altered. Kepel, 32, says it is still unclear whether French Muslims will one day be integrated into mainstream French society or simply insert themselves as a foreign body between its folds. But nobody ought to imagine French Muslims will just disappear. Many commentators on the book claim assimilation is inevitable. They say French society and culture is so powerful that even the most radical Muslims will little by little be absorbed. The sceptics prefer the insertion scenario, predicting that Muslims will form their own lobby with spokesmen and institutions that will eventually extract the same sort of recognition from the state enjoyed by Catholics, Protestants and Jews.

That has a catch. As a tolerant Western society, France will readily allot a niche to the purely religious aspects of Islam. But a conflict is in the making over Islam's vision of society and its political implications. The majority French favour a secular state and reject all religious influence on state affairs.

The huge majority of French Muslims are from North Africa and Muslim regions of Black Africa, either migrant workers or holders of French passports. Some are from Turkey. Only a handful are converts of purely French descent.

The bulk of the faithful who bow towards Mecca at the Grand Mosque de Paris in the Rue Jean-Pierre Timbaud are underprivileged outsiders clad in cheap clothes — mostly manual workers, many unable to read or write some have never attended any school. Well-off Muslims worship more discreetly or do not turn up for prayers at all, but they provide the cash that makes the flowering of Islam possible. A look at the bell-pushes in the plush West End of Paris shows plenty of residents of Arab extraction. Backing up their contributions are donations from Gulf Arab foundations or from the Islamic Republic of Iran. The flow of cash has ensured that most Muslims have a place of prayer near at hand.

In just 15 years the number of mosques and places of prayer has grown from just a dozen or so in the whole of France to 1,000. There are a total of 635 Islamic congregations or organisations incorporated under French law. The teachers of this new breed of Islam run the gamut from anti-Western militants to advocates of tolerance, but few preach a distinctively French form of Islam. Kepel sets out the choices in his book but does not predict which will win the day.

He says the anti-Western advocates of isloation from mainstream France are currently making the loudest pitch. They find a ready ear among mingrants ill at ease among the French, unable to speak the French language properly and chary of becoming integrated. The petty racism of day-to-day life in the midst of Christendom drives many such Muslims to take comfort in their religion.

Kepel's book contains many interviews showing that elderly people rediscover their sense of dignity in Islam and try hard to convey that sense to their children. Younger Muslims mostly identify with Islam but do not regard it as a contradiction to their Western lifestyle. Girls in Muslim families absorb French mores and behaviour more readily than any other group. Kepel proposes as the best solution that the French state take the initiative and try to integrate Muslims into mainstream life. He says that the minds and hearts of the Muslims will mainly be won in the schools, where the next generation is growing up. (DPA-Feature)

The Hindustan Times, December 11, 1987

جاپان میں اسلام

جاپان میں بدھزم کا آغاز اس طرح ہوا کہ کوریا کے راجہ نے شاہ جاپان (یماٹو) کو ۵۳۹ء میں ایک تحفہ بھیجا۔ یہ تحفہ دو چیزوں پر مشتمل تھا: گوتم بدھ کا مجسمہ اور ان کی تعلیمات کا ایک مختصر صحیفہ۔ کوریا کے راجہ نے لکھا کہ یہ سب سے زیادہ قیمتی چیز ہے۔ جو میں آپ کو بھیج سکتا ہوں۔ اس طرح بدھزم ایک مذہبی تحفہ کی شکل میں چھٹی صدی عیسوی میں جاپان میں داخل ہوا۔ اور تھوڑے دنوں بعد شہزادہ شوٹوکو (۵۷۴ - ۶۲۱) کے زمانہ میں جاپان کا سرکاری مذہب بن گیا۔

(مین اینڈ ہز گاڈ Man and his God)

عجیب بات ہے کہ یہی واقعہ اب سے پچاسی برس پہلے جاپان میں اسلام کے حق میں پیش آیا۔ مزید اس اضافہ کے ساتھ کہ اس بار شہنشاہ جاپان نے خود یہ فرمائش کی تھی کہ اسلام کو اس کے ملک میں بطور "تحفہ" بھیجا جائے۔ یہ ۱۸۹۱ء کا واقعہ ہے جب کہ عالم اسلام میں بے شمار بڑی بڑی شخصیتیں موجود تھیں۔ مگر اس پیش کش کے جواب میں کچھ نہ کیا جا سکا۔ حالاں کہ اگر بر وقت اس سے فائدہ اٹھایا جاتا تو آج نہ صرف جاپان بلکہ شاید ایشیا کی تاریخ دوسری ہوتی۔

جاپان کا پرانا قومی مذہب شنٹو ہے۔ مگر اس کی کوئی مقدس کتاب نہیں۔ یہ مذہب سے زیادہ قومی روایات کا ایک مجموعہ ہے۔ کنفیوشین مذہب تیسری صدی میں چین سے اور بدھ مت چھٹی صدی عیسوی میں کوریا سے جاپان آئے۔ جاپان کی بیشتر آبادی انھیں تینوں مذاہب کو مانتی ہے۔ سولھویں صدی کے نصف آخر میں عیسائی مذہب پرتگیزیوں کے ذریعے جاپان میں داخل ہوا، اور بہت سے جاپانیوں کو مسیحی بنانے میں کامیابی حاصل کی۔ مگر یہ پرتگیزی استعماری ذہن کے تحت جاپان میں داخل ہوئے تھے۔ مذہب کی آڑ میں انھوں نے جاپان کی سیاست پر قبضہ کرنے کی کوشش کی۔ یہ چیز جاپانیوں کو بے حد ناگوار تھی۔ پہلا پرتگیزی مشنری فرانسس زیویر ۱۵۴۹ میں جاپان میں داخل ہوا تھا۔ اس کے پچاس سال بعد مسیحیوں کے خلاف جاپان میں دارو گیر شروع ہو گئی۔ یہاں تک کہ ۱۶۱۲ میں ایک سخت فرمان جاری کیا گیا جس کے مطابق نہ کوئی مسیحی باہر سے آسکتا تھا اور نہ جاپان کا کوئی شہری مسیحی مذہب کو اختیار کر سکتا تھا۔ اس کے بعد ہزاروں عیسائی قتل کر دیئے گئے۔ ہزاروں نے عیسائیت کو چھوڑ کر دوبارہ اپنے آبائی مذہب کو اختیار کر لیا۔ عیسائیت کے مقدس نشان صلیب اور مسیح و مریم کے مجسموں کو توڑ ڈالا گیا۔ ۱۸۵۳ تک عیسائیت کو جاپان سے بالکل ختم کر دیا گیا تھا۔

مگر اٹھارویں صدی میں یورپ میں جو فکری انقلاب آیا اس نے صورت حال کو دوبارہ مغرب کے موافق کر دیا۔ اس صدی میں یورپ نے سیاسی اور سماجی علوم کی از سر نو تدوین کی۔ اس نے ثابت کیا کہ فرد کی آزادی وہ سب سے بڑی چیز ہے جو کسی سماج یا ریاست کو حاصل کرنے کی کوشش کرنا چاہئے۔ اس فکری سیلاب نے ساری دنیا میں ان لوگوں کو دفاع کی پوزیشن میں ڈال دیا جو فرد کی آزادی کو ختم یا محدود کر کے اپنا سماجی نظام بنائے ہوئے تھے۔

ایسی تمام قومیں اپنے حق میں استدلال کی طاقت سے محروم ہوگئیں، ان کے لئے اس کے سوا چارہ نہ رہا کہ وہ مغرب کے فکری یلغار کے آگے ہتھیار ڈال دیں۔

شہنشاہ میجی کے عہد سلطنت (۱۹۱۲ - ۱۸۶۸) میں ایک طرف جاپانی شہروں کی تعمیر کے لئے یورپ اور امریکہ کے عمارتی نقشے درآمد ہونا شروع ہوئے۔ دوسری طرف وہاں کے نظریات وافکار بھی جاپان پہنچے جن میں آزادی رائے کا نظریہ سرفہرست تھا۔ اس کے اثر سے سابق فیصلے پر نظرثانی ہونے لگی۔ ۱۸۷۳ میں خلافِ مسیحیت قانون کو منسوخ کردیا گیا۔ ۱۸۸۹ میں مغربی طرز کا دستور بنا جس میں جاپانیوں کے لئے مذہبی آزادی کا اعلان کیا گیا۔ اب پھر یورپ اور امریکہ کے عیسائی مشنری جاپان پہنچنے لگے، اور عیسائیت کی تبلیغ دوبارہ شروع ہوئی۔ تاہم بے پناہ سرمایہ خرچ کرنے کے باوجود عیسائی مذہب اختیار کرنے والوں کی تعداد میں کوئی نمایاں اضافہ نہ ہوسکا۔

زمانہ کے فکری دباؤ کے تحت قانون میں تبدیلی تو ہوگئی۔ مگر جاپان کے ہوش مند لوگ اب بھی خائف تھے کہ عیسائیت کو تبلیغ کی آزادی دینا ملک میں مغربی استعمار کے داخلہ کا سبب نہ بن جائے۔ چنانچہ انیسویں صدی کے آخر میں جب عیسائیت کے خلاف قانون کو ختم کیا گیا اسی زمانہ میں حکومت جاپان نے کچھ ایسی حفاظتی تدبیریں بھی کیں جن سے عیسائیت کو سیاسی خطرہ کی حد تک جانے سے روکا جاسکے۔ انھیں میں سے ایک یہ بھی تھا کہ شہنشاہ جاپان (میجی) نے ۱۸۹۱ میں ترکی خلیفہ سلطان عبدالحمید ثانی (۱۹۱۸ - ۱۸۴۲) کے نام ایک خصوصی مکتوب روانہ کیا۔ اس نے اپنے تعلق کا اظہار کرتے ہوئے سلطان ترکی کو لکھا تھا: "ہم دونوں مشرقی بادشاہ ہیں۔ ہماری اور ہماری قوم کی مصلحت یہ ہے کہ ہم دونوں ایک دوسرے سے قریب ہوں۔ اور ملتے رہیں۔ اور ہم دونوں کے درمیان تعلقات مضبوط ہوں تاکہ ہم مغربی قوموں کا مقابلہ کرسکیں جو تمام مشرقی سلطنتوں کو ایک نظر سے دیکھتی ہیں۔ آپ کو معلوم ہے کہ ہمارے یہاں مذہبی آزادی ہے۔ اس سے فائدہ اٹھا کر مغربی قومیں اپنا مذہب پھیلانے کے لئے جاپان میں اپنے مبلغین بھیج رہی ہیں۔ مگر میں دیکھتا ہوں کہ آپ لوگ ایسا نہیں کرتے۔ ہم پسند کریں گے کہ آپ اپنے مبلغین یہاں بھیجیں جو آپ کا مذہب اسلام یہاں کے لوگوں کو بتائیں۔ اس طرح امید ہے کہ آپ کے اور ہمارے درمیان معنوی رشتہ قائم ہوگا۔"

شہنشاہ جاپان کی طرف سے خط ملنے کے بعد سلطان عبدالحمید نے شیخ الاسلام، ناظر المعارف اور دوسرے علماء اور اہلِ فکر کو جمع کیا اور پوچھا کہ اس معاملہ میں کیا کیا جائے۔ لوگوں نے رائے دی کہ آستانہ (ترکی) میں جو اسلامی مدارس ہیں ان سے کچھ علماء منتخب کئے جائیں اور ان کو جاپان بھیجا جائے۔ اس مجلس میں سید جمال الدین افغانی (۱۸۹۷ - ۱۸۳۸) بھی شریک تھے۔ آخر میں سلطان نے کہا کہ آپ بھی اپنی رائے دیں۔ انھوں نے کہا: یہ علماء تو خود مسلمانوں کو اسلام سے دور کرنے کا سبب بن رہے ہیں۔ پھر وہ جاپانیوں کو اسلام سے قریب کرنے کا سبب کیسے بنیں گے۔ بہتر یہ ہے کہ کچھ لوگوں کو باقاعدہ تربیت دے کر تیار کیا جائے جو موجودہ زمانہ کی رعایت سے اسلام کی تبلیغ کی خصوصی صلاحیت رکھتے ہوں۔ پھر ان کو جاپان میں اسلام کی تبلیغ واشاعت کے لئے بھیجا جائے۔ اس وقت سلطان صرف یہ کریں کہ

میکاڈو (شہنشاہ جاپان) کے جواب میں شکریہ کا خط بھیج دیں اور یہ لکھ دیں کہ آپ کی رائے بہت مناسب ہے۔ ہم جلد ہی اس کے مطابق عمل کرنے کی کوشش کریں گے۔ چنانچہ سلطان نے کچھ تحفہ تحائف کے ساتھ ایک خط شہنشاہ جاپان کو بھیج دیا۔ (حاضر العالم الاسلامی، از امیر شکیب ارسلان)

فرانسس زیویر (۱۵۵۲-۱۵۰۶) جب ۱۵۴۹ میں گوا سے جاپان پہنچا تو مخالف حالات کے باوجود اس نے جاپانی زبان سیکھی اور مسیحیت کی تبلیغ شروع کی۔ مگر موافق حالات کے باوجود عالم اسلام میں کوئی جاپانی زبان سیکھنے کے لئے نہ اٹھا۔ سید جمال الدین افغانی اپنی صلاحیتوں کے اعتبار سے اس کام کے لئے موزوں ترین شخص تھے۔ سلطان عبدالحمید ان سے بے پناہ عقیدت رکھتا تھا۔ اگر وہ سلطان سے کہتے کہ آپ ایک ادارہ قائم کر دیجئے۔ میں اس کو چلاؤں گا اور اس میں جاپانی زبان میں اسلامی کتابوں کے ترجمے اور جاپان میں تبلیغ کرنے والے افراد تیار کروں گا تو سلطان فوراً راضی ہو جاتا۔ مگر جمال الدین افغانی کو اپنے سیاسی مشاغل سے فرصت نہ تھی۔ ان کے نزدیک سب سے بڑا کام یہ تھا کہ انگریزی اور فرانسیسی استعمار کو "قبر میں اتار دیا جائے"۔ وہ مغربی قوموں کا سیاسی اقتدار ختم کرنے کے لئے بے چین تھے۔ ایسی حالت میں کفر و شرک کو دنیا سے ختم کرنے کی بے چینی ان کے اندر کس طرح پرورش پاتی۔

How England was Lost to Islam?

Had powerful Moorish ruler Emir Mohammed Al-Nassir overlooked the fact that Islam borbids taking undue advantage of helpless people, England would have become a Muslim country in the 13th century—some 800 years ago.

Gabriel Ronay in his book "The Tarter Khan's Englishman" published by Cassel, disclosed that in 1213 King John of England sent a secret emissary of three persons to Moorish ruler Emir Mohammed Al-Nassir with offer of homage and promise that if England were to be received into the Arab fold King John would become the Emir's tribute-paying vassal and he along with his subjects convert to Islam.

Ronay came across verbatim account of secret emissary while researching for book on Robert Dad, London Catholic priest who was also one of the emissary sent to Al-Nassir and who was later excommunicated and banished from England by King John for his role in the Magna Carta rebellion of 1215.

This forgotten episode of English history when King John offered to become Muslim along with his subjects was dutifully recorded by Saint Alban's chronicler of 13th century, Mathew Paris. There is little to question veracity of his account writes Ronay, because he heard it straight from those emissaries.

Nasser's Rebuff: Baron Thoma Hardington, head of King John's emissary, according to Paris accounts, was instructed by John to tell Emir Al-Nassir "great King of Africa, Morocco and Spain that he would voluntarily give up to him, himself and his kingdom, and if he pleased, would hold it as tributary for him and that he would also abandon Christian faith which he considered false and would faithfully adhere to the law of Mohammed".

Baron Hardington, who was accompanied by Baron Relph Fitznicholas and Catholic priest Master Robert de London handed King John's letter to the Emir and with the aid of an interpreter proceeded to convey with oratorial skill the richness of England's soil, fertility of its fields and skill of its people "who are handsome and ingenious, are skilled in three languages, Latin, French and English as well as in every liberal and mechanical pursuit".

Ronay describes Emir's reply as "exceptionally level headed" when he said, "I have never read or heard that any king possessing such prosperous kingdom, subject and obedient to him, would thus voluntarily ruin his sovereignty by making tributary to a country that is free by giving to a stranger that which is his own by turning happiness to misery and thus giving himself up to will of another conquerred as it were without wound".

Upon his emissary's return to England, King John "wept bitterly in being baulked in his purpose".

Catholic priest, Master Robert de London later was excommunicated and banished from England as a result of his role in Magna Carta rebellion. He went to Mongolia to become Tartar Khan's chief diplomat and later to return to Europe eventually as head of the Tartars that converted nearly half of Europe to Islam.

SUNDAY TIMES (London) October 22, 1978

England could be a Muslim Country

It will come as a shock to anyone affected by the present-day Arab invasion of Lond—but for a crucial moment in the thirteenth century England faced the prospect of being totally converted—lock, stock and barrel—into a Muslim country.

In 1213, in a demented move of desperation, King John Lackland sent a secret embassy of three people to Emir Mohamed al-Nassir, the powerful Moorish ruler, with an offer of homage and the promise that, if England were to be received into the Arab fold, he would become the emir's tribute-paying vassal. John sought conversion to Islam as a way out of pressing political problems.

I came across a verbatim account of the secret embassy in a contemporary monastic chronicle, while researching a book on Robert de London, a Catholic priest who was ex-communicated and banished from England for his role in the Magna Carta rebellion.

This virtually forgotten episode of English history was dutifully recorded by Matthew Paris, a shrewd St Albans chronicler of thirteenth-century events. There is little reason to question the veracity of his account because he heard it straight from the horse's mouth.

According to Paris, the three-man embassy was composed of the barons Thomas Hardington and Ralph FitzNicholas, and Master Robert de London. Paris offers no explanation for the inclusion of the London priest but one likely reason is that John charged Master Robert, "the king's own cleric," to ensure the barons did not double-cross him.

Thomas Hardington, the head of the embassy, was instructed by John to tell "the great king of Africa, Morocco and Spain that he would voluntarily give up to him, himself and his kingdom, and if he pleased would hold it as tributary for him; and that he would also abandon the Christian faith, which he considered false, and would faithfully adhere to the law of Mohammed."

With that he handed King John's letter to the emir and, with the aid of an interpreter, proceeded to convey with oratorial skill the richness of England's soil, the fertility of its fields and the skills of its people "who are handsome and ingenious, are skilled in three languages—Latin, French and English—as well as in every liberal and mechanical pursuit."

The Moorish ruler's reply was exceptionally level-headed: "I have never read or heard that any king possessing such a prosperous kingdom subject and obedient to him, would thus voluntarily ruin his sovereignity by making tributary a country that is free, by giving to a stranger that which is his own, by turning happiness to misery and thus giving himself up to the will of another, conquered as it were without a wound."

After a typically Muslim appraisal of John's manliness, the emir refused the offer to embrace Islam "for he is a petty king, senseless and growing old...and unworthy of an alliance with me." And he told his envoys never to come into his presence again.

Upon the embassy's return to England, King John "wept with bitterness in being balked in his purpose." Perhaps believing that his barons had double-crossed him, he put the London priest in charge of the whole St Albans Abbey as a reward. His stewardship soon ended, however, because the monks bribed the king with 700 silver marks to have him removed.

Master Robert then crossed over to the barons' camp, fighting for a charter of rights. He was excommunicated and banished from England as a result of his role in the Magna Carta rebellion and was swept by the tide of events from London to the steppes of Mongolia, where he became the ferocious Tartar Khan's chief diplomat. He returned to Europe eventually at the head of the Asiatic hordes bent on the annihilation of our continent.

GABRIEL RONAY

(*The Tartar Khan's Englishman* was published las week by Cassel.)

SUNDAY TIMES (London) October 22, 1978

سلطنت موحدین کا حوصلہ مند فرماں روا عبدالمومن اندلس پر اپنے قبضہ کو مکمل کرنے کے بعد سارے یورپ کو فتح کرنا چاہتا تھا۔ مگر اس کی عمر نے وفا نہ کی۔ وہ پانچ لاکھ کے ناقابل تسخیر لشکر کو لے کر آگے بڑھنے والا تھا کہ جمادی الثانی ۵۵۸ھ میں اس کا انتقال ہو گیا۔ تاہم اس کی اگلی پشت میں امیر ابو عبداللہ محمد ناصر لدین اللہ کے زمانہ حکومت (۵۹۵ھ — ۶۱۰ھ) میں خود یورپ کی سیاست نے اس خواب کی تکمیل کے اسباب پیدا کر دیئے۔ اگرچہ ناصر لدین اللہ کی کم ہمتی کی وجہ سے یہ خواب تکمیل کو نہ پہنچ سکا۔

اس زمانہ میں جان لاک لینڈ (۱۱۶۷ — ۱۲۱۶ء) انگلستان کا بادشاہ تھا۔ یہی وہ بادشاہ ہے جس نے مشہور میگنا کارٹا (منشور آزادی) پر ۱۲۱۵ میں دستخط کئے تھے۔ اس کے زمانہ میں ملک کے کچھ امرار نے اپنے حقوق کی آزادی کا مطالبہ کیا۔ امرار اور بادشاہ کے درمیان کشمکش بڑھی۔ پوپ انوسنٹ سوم (۱۱۶۰ — ۱۲۱۶) نے اس معاملہ میں امرار کا ساتھ دیا۔ لندن کا پادری رابرٹ، جو اس مقابلہ میں بادشاہ کے ساتھ تھا، پوپ نے اس کو کلیسا سے خارج کر دیا۔ ان حالات میں شاہ جان نے یہ منصوبہ بنایا کہ وہ اندلس کے مسلم حکمران کا تعاون حاصل کر کے اپنے حریفوں کو شکست دے۔ اس نے ۱۲۱۳ء میں ناصر لدین اللہ کے پاس ایک خفیہ سفارت بھیجی۔ اس سفارتی وفد کے ارکان یہ تھے: ٹامس ہارڈنگٹن، رالف فرنکوس، ماسٹر رابرٹ۔ یہ وفد سمندری سفر کر کے مراقش پہنچا جہاں ناصر لدین اللہ مقیم تھا۔ وفد کے ارکان وسیع محل کے ایوان اور ڈیوڑھیوں سے گزرتے ہوئے، جن کے دونوں طرف شاہی خدام کی صفیں کھڑی ہوئی تھیں، امیر ناصر لدین اللہ کے سامنے پہنچے۔ انھوں نے امیر کو شاہ جان کا خط پیش کیا اور ترجمان کے ذریعہ امیر سے گفتگو کی۔ اپنے بادشاہ کی ہدایت کے مطابق انگلستانی وفد نے ناصر لدین اللہ سے کہا کہ اگر آپ شاہ جان کی مدد کریں تو وہ آپ کے باج گزار بن جائیں گے۔ نیز یہ کہ عیسائیت پر ان کا اعتقاد ختم ہو گیا ہے اور وہ "افریقہ اور مراقش اور اسپین کے عظیم بادشاہ" کے ہاتھ پر اسلام قبول کرنے کے لئے تیار ہیں اور اسی کے ساتھ ان کی رعایا بھی۔ وفد نے انگلستان کی تعریف میں مزید کہا کہ وہ ایک زرخیز ملک ہے۔ اس کے باشندے تین زبانوں کو جاننے والے ہیں: لاطینی، فرانسیسی اور انگریزی۔ وہ مختلف قسم کی فنی صلاحیتیں بھی رکھتے ہیں۔

مگر امیر ناصر لدین اللہ نے اس پیش کش کو قبول نہیں کیا۔ اس نے اس کو سیاسی چال سمجھا۔ اس نے کہا "میں نے کبھی نہیں سنا کہ کوئی بادشاہ جس کے پاس اتنا قیمتی ملک ہو، خود سے اپنے آپ کو دوسرے بادشاہ کے حوالے کر دے۔" اس نے وفد کے لوگوں کو اپنے دربار سے نکال دیا اور کہا کہ اب کبھی میرے پاس نہ آنا۔ اس واقعہ کا ذکر کرتے ہوئے گیبریل رد نے لکھا ہے:

"تیرھویں صدی عیسوی میں انگلستان مکمل طور پر ایک مسلم ملک بن جاتا اگر ناصر لدین اللہ شاہ جان کی پیش کش کو قبول کر لیتا"

شاہ انگلستان کے اسلام کو قبول نہ کرنا ناصر لدین اللہ کے لئے مہنگا پڑا۔ ۶۰۹ھ میں یورپی فوجیں بہت بڑی تعداد میں شاہ الفانسو کے جھنڈے کے نیچے جمع ہو کر مسلم اندلس پر حملہ آور ہوئیں۔ ناصر لدین اللہ کے ساتھ چھ لاکھ کا لشکر تھا۔ مگر امیر کی نااہلی کی وجہ سے اس کو بری طرح شکست ہوئی۔ بیشتر مسلم فوجی العقاب کے میدان میں عیسائیوں کے ہاتھوں مار ڈالے گئے۔ ایک عظیم امکان ایک بدترین انجام میں تبدیل ہو گیا۔

فطرت انسانی

لاہور کے اردو روزنامہ نوائے وقت کے شمارہ ۲۰ ستمبر ۱۹۹۲ میں ایک خبر چار سطری سرخیوں کے ساتھ چھپی ہے۔ اس میں بہت سبق ہے۔ وہ خبر نوائے وقت کے الفاظ میں یہ ہے:

سابق سوویت یونین کے تین جنگی قیدیوں نے رہائی کے بعد افغانستان سے اپنے وطن واپس جانے سے انکار کر دیا ہے اور کہا ہے کہ وہ افغانستان میں ہی قیام کرنا چاہتے ہیں۔ ان جنگی قیدیوں کو افغانستان کے وزیراعظم گلبدین حکمت یار اور روسی وزیر خارجہ کے درمیان ہونے والی بات چیت کے بعد پہلے مرحلے میں رہائی ملی۔ بی بی سی کے مطابق ان تین قیدیوں میں سے ایک کا تعلق یوکرائن اور دو کا تعلق روس سے ہے۔ رہائی پانے والے ان مذکورہ افراد کا کہنا ہے کہ وہ اسلامی تعلیمات سے بے حد متاثر ہوئے ہیں اور اسلام کی محبت سے معمور ہو کر اپنی باقی زندگی افغانستان میں ہی گزارنا چاہتے ہیں۔ انھوں نے اپنے اس فیصلہ سے افغانستان میں روس کے ناظم الامور کو آگاہ کر دیا ہے۔ جنھوں نے گزشتہ روز شمالی افغانستان میں ان سے ملاقات کی۔ روسی ناظم الامور اپنی ہر ممکن کوشش کے باوجود انھیں وطن واپس جانے پر قائل نہ کر سکے۔ اس مرحلہ پر روس کے ناظم الامور نے افغان وزیراعظم حکمتیار سے بھی دائرلیس پر بات کی لیکن افغان وزیراعظم نے انھیں جواب دیا کہ رہائی پانے والے قیدی اپنے مستقبل کا خود فیصلہ کریں گے۔ رہائی پانے والے روسی قیدیوں کا کہنا ہے کہ قید کے دوران ان سے قیدیوں والا نہیں بلکہ مجاہدین گروپوں کے ارکان جیسا سلوک کیا گیا۔ انھوں نے بتایا کہ وہ حکمتیار گروپ کی قید میں رہے۔ افغانستان میں سابق سوویت یونین کے مزید ۸۰ جنگی قیدی موجود ہیں۔

اس خبر پر غور کیجئے۔ جب تک روسی فوج اور افغانی فوج میں جنگ ہو رہی تھی، دونوں ایک دوسرے کے دشمن تھے۔ مگر جب دونوں کے درمیان لڑائی بند ہو گئی اور امن کے حالات میں دونوں کو ایک دوسرے کو دیکھنے کا موقع ملا تو دونوں ایک دوسرے کے دوست ہو گئے۔ حتیٰ کہ روسی فوجی نے اسلام قبول کر لیا۔

اسلام دین فطرت ہے۔ اس دنیا میں پیدا ہونے والا ہر آدمی اسی دین فطرت پر پیدا ہوا ہے۔ کوئی آدمی صرف غیر معتدل حالات میں ہی اپنی فطرت سے بیگانہ ہو سکتا ہے۔ حالات میں اعتدال آتے ہی ہر آدمی اپنی فطرت کو پہچان لے گا اور فطری دین کو اپنا دین بنا لے گا۔

فتح اسلام

پیغمبر اسلام صلے اللہ علیہ وسلم کے ابتدائی زمانہ کا واقعہ ہے۔ مکہ کے مخالفین نے مشورہ کیا کہ اپنے اندر کے ایک سمجھ دار شخص کو چنیں تاکہ وہ پیغمبر اسلام کے پاس جاکر ان سے گفتگو کرکے انھیں قائل کر سکے۔ اس مقصد کے لیے ابوالولید عُتبہ بن ربیعہ کا انتخاب کیا گیا جو مکہ کے سرداروں میں سے تھا اور نہایت ذہین اور ہوشیار آدمی سمجھا جاتا تھا۔

عُتبہ نے پیغمبر اسلام صلے اللہ علیہ وسلم سے ملاقات کی اور آپ سے تفصیلی گفتگو کی۔ اس گفتگو کے آخر میں پیغمبر اسلام نے عُتبہ کو قرآن (حٰم السجدہ) کی ابتدائی آیتیں سنائیں۔

روایات بتاتی ہیں کہ عتبہ اپنا دونوں ہاتھ پیچھے کی طرف زمین پر ٹیک کر بیٹھ گیا اور حیرت اور خاموشی کے ساتھ قرآن کی آیتیں سنتا رہا۔ اس کے بعد عتبہ وہاں سے واپس ہوا تو حسب وعدہ اپنے ساتھیوں کے پاس نہیں گیا، بلکہ اپنے گھر پر بیٹھ گیا۔ ابوجہل کو معلوم ہوا تو اس کو اندیشہ ہوا کہ عتبہ شاید محمدؐ کے کلام سے متاثر ہوگیا۔ وہ اپنے ساتھیوں کے ہمراہ عتبہ کے گھر گیا۔ اس نے کہا کہ خدا کی قسم اے عتبہ، ہم تمہارے پاس صرف اس لیے آئے ہیں کہ ہم کو اندیشہ ہے کہ تم محمدؐ کی طرف مائل ہوگیے اور محمدؐ کا دین تم کو پسند آگیا (واللہ یا عُتبۃ ما جئنا الا انک صبوت الیٰ محمّد و اعجبك امره، صفحہ ۵۰۲)

اس سلسلہ میں کافی تفصیل سیرت کی کتابوں میں نقل کی گئی ہے۔ خلاصہ یہ کہ عتبہ نے کہا کہ خدا کی قسم، اس آدمی کی زبان سے میں نے ایسا کلام سنا جیسا کلام میرے کانوں نے کبھی نہیں سنا تھا۔ اس کو سن کر میں اتنا مسحور ہوگیا کہ میری سمجھ میں نہیں آیا کہ میں اس کا کیا جواب دوں (واللہ لقد سمعتُ من ھذا الرجل کلامًا ما سمعتْ اذنای کلامًا مثلہ وما دریتُ ما اَرُدُّ علیہ، صفحہ ۵۰۵) سیرۃ ابن کثیر، المجلد الاول۔

اسلام کی چودہ سو سال کی تاریخ میں مسلسل ایسے واقعات پیش آتے رہے ہیں جب کہ ایک شخص کسی دوسرے مقصد کے تحت اسلام سے قریب ہوا۔ مگر جب اس نے اسلام کی تعلیمات کو جانا تو اس کے دل نے اس کی سچائی پر گواہی دی، اور اس نے خود اپنے جذبہ کے تحت اسلام

قبول کر لیا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اسلام عین فطرتِ انسانی کے مطابق ہے۔ چنانچہ جب کوئی شخص اسلام سے قریب ہوتا ہے تو وہ عین اپنی اندرونی فطرت کے زور پر اسلام کی طرف کھنچ اٹھتا ہے اور اس کے دائرہ میں داخل ہو جاتا ہے۔

ایسے واقعات ماضی میں بھی کثرت سے پیش آئے، اور حال میں بھی کثرت سے پیش آرہے ہیں۔ الرسالہ دسمبر ۱۹۷۶ میں اسی قسم کا ایک واقعہ جاپان سے متعلق شائع کیا گیا تھا۔

مسٹر سبورو ایک جاپانی پروفیسر تھے۔ ان سے کہا گیا کہ وہ جاپانی انسائیکلو پیڈیا کے لیے اسلام پر ایک آرٹیکل تیار کریں۔ اس مقصد کے تحت انھوں نے اسلام کا مطالعہ شروع کیا۔ مطالعہ کے دوران ان پر اسلام کی سچائی روشن ہوتی چلی گئی۔ ان کے دل نے گواہی دی کہ یہی انسانیت کا حقیقی مذہب ہے۔ یہاں تک کہ جب ان کا آرٹیکل تیار ہوا تو وہ خود بھی اسلام قبول کر کے عملاً اسلام کے دائرہ میں داخل ہو چکے تھے۔ یہ واقعہ ۱۹۳۰ کا ہے (صفحہ ۳۴)

اس سلسلہ کی ایک تازہ مثال وہ ہے جو مکہ کے عربی ہفت روزہ اخبار العالم الاسلامی (۲۹ ربیع الثانی ۱۴۱۰ھ، ۲۷ نومبر ۱۹۸۹ء) میں شائع ہوئی ہے۔ یہ ایک تفصیلی رپورٹ ہے جس کا عنوان ہے:

فشل المخطط الكنسي لأفرقة التنصير

اس رپورٹ میں بتایا گیا ہے کہ عیسائی تنظیموں نے اعلیٰ تربیت کے ذریعہ ۵۳۶۴ مبلغین تیار کیے اور ان کو افریقی ملک لیبیریا کی راجدھانی منروویا (Monrovia) بھیج دیا۔ ان کا مشن یہ تھا کہ وہ خاموش تبلیغ کے ذریعہ لیبیریا (Liberya) کے دس لاکھ مسلمانوں کو مسیحی مذہب میں داخل کر دیں۔

یہ مسیحی مبلغین تمام علمی اور مادی ذرائع سے پوری طرح مسلح تھے۔ ان کو اتنا زیادہ تیار کیا گیا تھا کہ وہ لیبیری قبائل کی مقامی زبانیں، مانکا، بانیکا، منیکا، کیسکا، بلیکا، نہایت روانی کے ساتھ بولتے تھے۔

ان تمام تیاریوں کے باوجود نتیجہ الٹا ہوا۔ ان مسیحی مبلغین کی بیشتر تعداد نے وہاں پہونچ کر اسلام قبول کر لیا۔ جس ملک میں وہ مسیحیت کی تبلیغ کے لیے بھیجے گئے تھے، وہاں اب وہ

اسلام کی تبلیغ کرنے میں مشغول ہیں۔ انھوں نے بتایا کہ تربیت کے دوران انھیں مختلف مذہبوں کا مطالعہ کرایا گیا تھا، مگر اس نظام کے تحت انھیں اسلام کی صرف مسخ شدہ تعلیمات ہی سے واقف کرایا گیا۔ لیبیریا میں جب ان کا سابقہ مسلمانوں سے ہوا تو انھیں موقع ملا کہ وہ اسلام کو زیادہ صحیح صورت میں جان سکیں۔ اس واقفیت کے بعد ان کی آنکھ کھل گئی۔

رپورٹ میں بتایا گیا ہے کہ عیسائی تنظیموں نے اس مقصد کے لیے افریقی نسل کے مسیحیوں کا انتخاب کیا تھا تاکہ وہ لیبیریا پہونچیں تو وہ وہاں کے لوگوں کو اجنبی نہ دکھائی دیں۔ ان کو بتایا گیا کہ وہ ملک کی قبائلی زبانوں میں مہارت حاصل کریں اور وہاں کے سماج میں گھل مل کر خاموشی کے ساتھ اپنا کام کریں۔ چنانچہ یہ لوگ مسلم آبادیوں کے درمیان غیر محسوس طریقہ پر آباد ہو گئے۔ ان میں بہت سے لوگوں نے لیبیریا کی نیشنلٹی کا سرٹیفکٹ بھی حاصل کر لیا۔ اسی خاص انداز کار کی وجہ سے اس منصوبہ کا نام اَلْفِرْقَةُ الْتَّنْصِیرُ رکھا گیا تھا۔

لیبیریا کی مسلم تنظیموں کو جب اس واقعہ کا علم ہوا تو انھوں نے شور و غل کا طریقہ اختیار نہیں کیا۔ بلکہ جوابی تبلیغی عمل شروع کر دیا۔ مثلاً انھوں نے ملک کے مختلف شہروں ــــــ فونجاما، کاکاتا، سنکولی، کاتیلا وغیرہ میں اجتماعات شروع کیے اور آل مذاہب کانفرنسیں منعقد کیں۔ ان میں لوگوں کو موقع دیا گیا کہ وہ ہر مذہب کے بارہ میں کھل کر بحث و مذاکرہ کریں۔ ان کانفرنسوں میں مسیحی علماء کو سخت ناکامی ہوئی۔ مسلم علماء کے مقابلہ میں وہ نہ علمی سطح پر اپنا دفاع کر سکے اور نہ دلائل کے ذریعہ اپنے مذہب کی برتری ثابت کرنے میں کامیاب ہوئے۔

دوسری طرف ان کانفرنسوں کے ذریعہ یہ ہوا کہ اسلام کی سچائی اور برتری نمایاں ہو کر سامنے آگئی۔ اس سے ان مسیحی مبلغین میں مایوسی اور ذہنی انتشار پیدا ہوا۔ ان میں سے بہت سے لوگوں نے اپنے موجودہ مشغلہ کو اپنی فطرت کی آواز کے خلاف سمجھا۔ وہ عیسائیت کے بجائے اسلام کی مزید تحقیق میں لگ گئے۔ یہاں تک کہ ان کی اکثریت نے قبول اسلام کا اعلان کر دیا۔ جو لوگ مسیحی مبلغ بن کر آئے تھے، وہ اسلام کے مبلغ اور اس کے علم بردار بن گئے۔

جس اسلام کی طاقت اتنی زیادہ ہو، اس کے ماننے والے اگر یہ نعرہ لگائیں کہ اسلام خطرہ میں ہے (Islam is in danger) تو ایسے لوگوں سے زیادہ نادان قوم اس دنیا میں اور کوئی نہیں۔

باب چہارم :

امکاناتِ دعوت

ابدی امکان

قرآن میں بتایا گیا ہے کہ وہ اللہ ہی ہے جو امور کائنات کا نظم کر رہا ہے، اور وہ اللہ ہی ہے جو اپنے پیغمبروں کے اوپر اپنی آیتیں نازل کرتا ہے (یدبر الامر یفصل الآیات) الرعد ۲

اس سے معلوم ہوا کہ کائناتی واقعات، مثلاً زمین کی گردش یا بارش کا برسنا، خدا کے حکم کے تحت ہوتا ہے۔ اسی طرح قرآن میں جو باتیں بتائی گئی ہیں وہ بھی خدا کے حکم کے تحت ہیں۔ دونوں ہی خدائی مقدرات ہیں۔ کوئی شخص اس پر قادر نہیں کہ وہ زمین و آسمان کے نظام میں تبدیلی پیدا کر دے۔ اسی طرح کوئی اس پر بھی قادر نہیں کہ وہ حیات انسانی کے بارہ میں خدا کے مقرر کیے ہوئے قوانین کو بدل دے۔

حیات انسانی کے بارہ میں قرآن میں جو قوانین بتائے گئے ہیں ان میں سے ایک قانون یہ ہے کہ اس دنیا میں کبھی ایسا نہیں ہو سکتا کہ یہاں مسائل ہی مسائل ہوں، اور مواقع کا بالکل خاتمہ ہو گیا ہو۔ یہاں ہمیشہ ایسا ہوگا کہ جہاں کچھ مشکل ہوگی وہیں آسانیاں بھی اسی کے ساتھ ضرور موجود رہیں گی (فان مع العسر یسرا۔ ان مع العسر یسرا) الانشراح

کوئی شخص، خواہ وہ کتنا ہی طاقتور ہو، اس پر قادر نہیں کہ وہ آپ کے اوپر صبح کے آنے کو روک دے۔ رات کے بعد ضرور صبح آئے گی اور آپ کے گھر کے اوپر اس کی روشنی پھیل کر رہے گی۔ اسی طرح کسی کے بس میں یہ بھی نہیں کہ وہ آپ کو ایسی مشکل میں ڈال دے کہ اس کے بعد آسانی کی کوئی صورت آپ کے لیے باقی ہی نہ رہے۔ یہ خدائی مقدرات میں سے ہے کہ مشکلات راہ کے ساتھ عین اسی وقت مواقع کار بھی آپ کے لیے موجود رہیں۔ یہ خدا کا مقرر کیا ہوا ایک محکم قانون ہے، اور اس کو بدل دینا کسی بھی شخص یا گروہ کے لیے کسی بھی حال میں ممکن نہیں۔

یہی وجہ ہے کہ اسلام میں مایوسی کو حرام قرار دیا گیا ہے۔ جو آدمی خدا پر یقین رکھتا ہے۔ اس کو اس نظام خداوندی پر بھی محکم یقین رکھنا ہے کہ اس دنیا میں اس کے لیے راہیں کبھی بند نہیں ہوں گی۔ اس کے لیے اس دنیا میں امید کا پہلو ہمیشہ باقی رہے گا۔ اور جب خدا نے امید کے پہلو کو اتنا زیادہ یقینی بنا دیا ہو تو اس کو یہ بھی حق ہے کہ وہ اپنے بندوں کے لیے مایوسی کو حرام قرار دے دے۔

عجیب فرق

رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم مکہ سے طائف کی طرف جارہے تھے۔ درمیان میں آپ کا گزر ایک ایسے راستے سے ہوا جو بظاہر دشوار اور تنگ تھا۔ آپ نے پوچھا کہ اس راستے کا نام کیا ہے۔ لوگوں نے کہا کہ الضیقہ (تنگ)۔ آپ نے فرمایا کہ نہیں، وہ تو الیسریٰ (آسان) ہے:

ثم سلك في طريق يقال لها الضَّيقة۔ فلما توجه فيها رسول الله صلى الله عليه وسلم سأل عن اسمها۔ فقال: ما اسمُ هٰذه الطريق۔ فقيل له الضَّيقة۔ فقال: بل هي اليُسرىٰ (سیرۃ ابن ہشام، ۴/ ۱۲۷)

حضرت علیؓ کے یہاں پہلا لڑکا پیدا ہوا تو انھوں نے اس کا نام حرب (جنگ) رکھا۔ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کو معلوم ہوا تو آپ نے اس کو ناپسند فرمایا اور اس کا نام حسن رکھا۔ حضرت علیؓ کے یہاں دوسرے لڑکے کی پیدائش ہوئی تو دوبارہ انھوں نے اس کا نام حرب رکھنا چاہا۔ آپ نے دوبارہ انھیں اس سے منع کر دیا اور لڑکے کا نام حسین تجویز کیا۔ ایک بار آپ کی ملاقات ایک شخص سے ہوئی۔ آپ نے ان کا نام پوچھا۔ انھوں نے کہا کہ حزن (غم)۔ آپ نے فرمایا: بل انت سهل (نہیں تمہارا نام تو آسان ہے)

رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کا گزر ایک قبیلہ پر ہوا۔ آپ نے پوچھا کہ تم کون لوگ ہو۔ انھوں نے کہا بنو غیّان (گمراہوں کی اولاد) آپ نے فرمایا: بل انتم بنو رشدان (بلکہ تم ہدایت یافتہ لوگوں کی اولاد ہو) غزوۂ ذی قرد کے سفر میں آپ کا گزر ایک کنویں سے ہوا۔ آپ نے کنویں کا نام پوچھا۔ لوگوں نے بتایا کہ بئسان (کھاری) آپ نے فرمایا کہ نہیں۔ بلکہ اس کا نام نعمان (عمدہ) ہے۔

موجودہ دنیا میں ہر چیز کا ایک تاریک پہلو ہوتا ہے، اور دوسرا اس کا روشن پہلو۔ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کا طریقہ یہ تھا کہ آپ ہمیشہ چیزوں کے تاریک پہلو کو نظرانداز کر کے صرف اس کے روشن پہلو کو دیکھتے تھے اور لوگوں کو اسے دکھاتے تھے۔ موجودہ زمانہ کے مسلم رہنماؤں کا طریقہ اس کے بالکل برعکس ہے۔ وہ چیزوں کے صرف تاریک رُخ کو دیکھ پاتے ہیں، اس کا روشن رخ ہمیشہ ان کی نگاہوں سے اوجھل رہتا ہے۔ اس کے باوجود وہ سمجھتے ہیں کہ وہ پیغمبر اسلام کے امتی ہیں۔

عظیم امکان

امریکی میگزین ٹائم (۴ جولائی ۱۹۸۸) کی کور اسٹوری کا موضوع جاپان کی اقتصادی ترقی ہے۔ اس کا عنوان ہے عظیم جاپان Super Japan چار صفحہ کے اس مضمون میں بتایا گیا ہے کہ اقتصادی ترقی کے اعتبار سے اب جاپان کی صدی شروع ہو رہی ہے اور امریکہ کی صدی اب خاتمہ کو پہونچ گئی ہے :

The American century is over (p.4).

مضمون میں مختلف قسم کی تفصیلات دیتے ہوئے کہا گیا ہے کہ بیسویں صدی کے آخر کا سب سے اہم واقعہ جاپان کا سب سے بڑی طاقت (Major superpower) کی حیثیت سے ابھرنا ہے۔ ۱۹۸۸ میں جاپان نے ۱۰ بلین ڈالر بیرونی قرضہ دیا ہے، جب کہ اس کے مقابلہ میں امریکہ کے بیرونی قرضہ کی مقدار ۹ بلین ڈالر ہے۔ آئندہ جاپان ۵۰ بلین ڈالر بیرونی قرضہ دینے کا منصوبہ بنا رہا ہے۔ اس طرح وہ دنیا کا سب سے بڑا معطی ملک بن جائے گا۔

ورلڈ بینک کا صدر ہمیشہ صرف امریکی ہوا کرتا تھا۔ مگر اب جب کہ ورلڈ بینک میں سب سے زیادہ سرمایہ جاپان کا ہے، یہ ناگزیر ہو گیا ہے کہ ورلڈ بینک کا صدر جاپانی ہو۔ پچھلے ۴۰ سال سے امریکہ واحد سب سے بڑی اقتصادی طاقت (Economic superpower) کی حیثیت رکھتا تھا۔ اب یہ حیثیت تیزی سے جاپان کو ملتی جا رہی ہے۔ جاپان اقوام متحدہ کے بجٹ کا گیارہ فی صد حصہ ادا کر رہا ہے جو امریکہ کے بعد نمبر ۲ پر ہے۔ چنانچہ امریکہ اب اس کی حمایت کر رہا ہے کہ جاپان سیکورٹی کونسل کا چھٹا مستقل ممبر بنا دیا جائے۔

تاہم ان ساری ترقیوں کے باوجود جاپان ایک سنگین مسئلہ سے دوچار ہے۔ اس کے سامنے کوئی واضح مقصد (Clear goal) نہیں۔ جاپان کے پاس ڈیموکریسی یا کمیونزم جیسا کوئی قابل برآمد نظریہ (Exportable ideology) نہیں۔ جاپان کی وزارت خارجہ کے ایک سابق افسر ہڈیاکی کاسے (Hideaki Kase) نے کہا کہ ہمارے پاس کچھ آدرش ہونا چاہیے جس میں عالم انسانی کے لیے اپیل ہو :

There must be some ideal that we have that would appeal to mankind (p.5).

مسلمانوں کے نزدیک اب تک "جاپان" کا تصور صرف یہ ہے کہ وہ جاپان کا الکٹرانک سامان اور جاپان کی نئی ماڈل کی کار خریدیں اور اس پر فخر کریں۔ حالاں کہ جاپان میں ان کے لیے اس سے کہیں زیادہ بڑا امکان چھپا ہوا ہے۔ اب تک وہ جاپان سے صرف "لینے والے" بنے ہوئے تھے، مگر نئے حالات بتاتے ہیں کہ وہ جاپان کے لیے "دینے والے" بن سکتے ہیں۔

مسلمانوں کے پاس اسلام ہے۔ جو محفوظ دین ہے۔ اس کی تاریخ نے اس کو ایک مسلّمہ حقیقت کی حیثیت دیدی ہے۔ جس خدا نے انسان کو بنایا ہے، اسی خدا نے اس دین کو بھی وضع کیا ہے، یہی وجہ ہے کہ وہ تمام انسانی تقاضوں کے عین مطابق ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اسلام عین وہی چیز ہے جس کو جاپان اور دوسری قومیں تلاش کر رہی ہیں ——— صحیح ترین آئیڈیل جو کسی انسان کو حقیقی تسکین دے، اور جس کے اوپر کوئی قوم حقیقی طور پر کھڑی ہو سکے۔

آج مسلمانوں کے کرنے کا سب سے بڑا کام یہی ہے کہ وہ اسلام کی ربانی دعوت کو لے کر اٹھیں اور اس کو جاپانیوں اور دوسری قوموں کے سامنے پیش کریں۔ موجودہ زمانہ میں اگر کوئی افرض الفرائض ہے تو بلاشبہ وہ یہی دعوت ہے۔ مسلمان اگر اس کے لیے اٹھیں تو وہ اپنے لیے ایک عظیم کام پالیں گے — دوسروں تک ایک عظیم خدائی تحفہ پہونچانے کا سبب بنیں گے۔

آج کی دنیا میں دعوتِ اسلامی کے جو عظیم امکانات پیدا ہوئے ہیں، ان کو جاننا اور انھیں استعمال کرنا بلاشبہ مسلمانوں کے لیے سب سے بڑا فریضہ ہے۔ اگر مسلمان ان مواقع کو استعمال کریں تو وہ دنیا و آخرت میں سب سے بڑی سرخروئی حاصل کریں گے۔ اور اگر وہ ان مواقع کو استعمال نہ کریں تو بلاشبہ یہ سب سے بڑا جرم ہے۔ اس کے بعد شدید اندیشہ ہے کہ وہ غضب الٰہی کے مستحق ہو جائیں، اور پھر کوئی بھی چیز نہ ہو جو انھیں اللہ کی پکڑ سے بچا سکے۔

منصوبۂ خداوندی

قرآن میں مومنین صالحین کو خیر البریہ کہا گیا ہے اور ان کے لئے ہمیشہ کی جنت کا وعدہ کیا گیا ہے (البینہ) یہ کون لوگ ہیں جو اس عظیم فضل کے مستحق قرار پائیں گے۔ ایک لفظ میں، یہ وہ لوگ ہیں جن کی صفت یہ ہوگی کہ وہ اللہ سے راضی ہوگئے اور اللہ ان سے راضی ہوگیا (رضی اللہ عنہم ورضوا عنہ)

مومن کے اللہ سے راضی ہونے (ورضوا عنہ) کا ایک پہلو خالص شخصی ہے۔ یعنی اپنی ذات کے معاملہ میں اپنی پسند کو چھوڑ کر اللہ کی پسند کو اختیار کر لینا۔

اس کا دوسرا پہلو وہ ہے جو دنیا میں اللہ کے منصوبہ کو جاری کرنے سے تعلق رکھتا ہے۔ اس اعتبار سے ورضوا عنہ کا مطلب یہ ہے کہ اہل ایمان اپنے آپ کو اللہ کے منصوبہ میں شامل کریں۔ وہ اپنے جان و مال کو منصوبۂ الٰہی کی تکمیل میں لگانے پر راضی ہو جائیں۔

اس معاملہ کی پہلی اور کامل مثال وہ ہے جو اصحاب رسول نے اپنی قربانیوں سے قائم کی۔ پیغمبر آخر الزماں صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں اللہ کا خاص منصوبہ یہ تھا کہ ایک ایسا انقلاب لایا جائے جس کے بعد صرف عقیدۂ توحید کو فکری عظمت حاصل رہے۔ دوسرے تمام عقیدے اور نظریے اپنا فکری جواز کھو دیں۔ یہی بات ہے جو قرآن میں ان لفظوں میں کہی گئی ہے: وقاتلوھم حتی لا تکون فتنۃ۔

اس مقصد کو حاصل کرنے کے لئے عالمی سطح پر ایک عظیم انقلاب لانا تھا جو صرف عظیم قربانی ہی کے ذریعہ ممکن ہو سکتا تھا۔ صحابہ کرام نے پوری رضامندی کے ساتھ اپنے آپ کو اس منصوبۂ الٰہی میں شامل کیا۔ اس میں وہ اس حد تک پورے اترے کہ ان کی زندگی ہی میں ان کے بارے میں اعلان کر دیا گیا کہ رضی اللہ عنہم۔

اس انقلاب کے مختلف پہلو تھے۔ اس کا ایک پہلو یہ تھا کہ خدا کے دین کو ایک تاریخی واقعہ بنا دیا جائے۔ اس سے پہلے ایک سو ہزار سے زیادہ پیغمبر آئے۔ مگر دین خداوندی ایک تسلیم شدہ واقعہ کی حیثیت سے تاریخ میں ریکارڈ نہ ہو سکا۔ صحابۂ کرام نے اپنی قربانیوں سے دین خداوندی کو مرحلۂ دعوت سے نکال کر مرحلۂ انقلاب اور درجۂ استحکام تک پہنچا دیا۔

آج دوبارہ اللہ تعالیٰ کا ایک منصوبہ ہے۔ وہ دوبارہ تقاضا کر رہا ہے کہ اہل ایمان اپنے آپ

کو اس منصوبۂ خداوندی میں شامل کریں۔ وہ اپنی تمام طاقتیں خرچ کرکے اس منصوبہ کو تکمیل تک پہنچائیں۔ جو لوگ اس پر راضی ہوں کہ وہ اپنے آپ کو خدا کے اس منصوبہ میں شامل کریں، ان کے لئے خدا کی طرف سے پیشگی طور پر یہ خوش خبری ہے کہ وہ ان سے راضی ہوگا اور ان کو ابدی جنتوں میں داخل کرے گا۔

یہ منصوبہ کیا ہے۔ یہ ایک حدیث سے معلوم ہوتا ہے۔ امام احمد اور دوسرے محدثین نے اس کو سند صحیح سے نقل کیا ہے۔ حضرت مقداد کہتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ کہتے ہوئے سنا کہ زمین کی سطح پر کوئی کچا یا پکا گھر ایسا نہیں بچے گا، مگر یہ کہ اللہ تعالیٰ اس میں اسلام کا کلمہ داخل کر دے گا (لا یبقیٰ علیٰ ظہر الارض بیت مدر ولا وبر الا ادخلہ اللہ کلمۃ الاسلام، مشکوۃ المصابیح، الجزء الاول، صفحہ ۲۰)

قدیم زمانہ میں یہ واقعہ ممکن نہ تھا۔ کیوں کہ اس زمانہ میں اس کے ذرائع حاصل نہ تھے۔ موجودہ زمانہ میں جو وسائل اعلام (پرنٹ میڈیا، الکٹرانک میڈیا) ظہور میں آئے ہیں، انھوں نے پہلی بار اس کو ممکن بنایا ہے کہ ساری دنیا کے ایک ایک گھر میں اسلام کا پیغام پہنچایا جاسکے۔

جدید وسائل اعلام کے ظہور کے باوجود دوسری دنیا (کیونسٹ بلاک) میں اسلام کا پیغام پہنچانا بظاہر ناممکن نظر آرہا تھا۔ مگر ۹۰ - ۱۹۸۹ میں جو تبدیلیاں سامنے آئی ہیں انھوں نے حیرت انگیز طور پر اس رکاوٹ کو بھی ختم کر دیا ہے۔ ٹائم میگزین (۱۲ مارچ ۱۹۹۰) نے بجا طور پر اس کو سوویت ایمپائر کے انہدام سے تعبیر کیا ہے۔ اس کے بعد سوویت روس میں از سر نو اسلام کی اشاعت کے نئے دروازے کھل گئے ہیں۔ ٹائم (۱۲ مارچ ۱۹۹۰) نے ایک باتصویر رپورٹ چھاپی ہے۔ اس کا عنوان بامعنی طور پر یہ ہے کہ کارل مارکس محمد کو جگہ دیتا ہے:

Karl Marx makes room for Muhammad

جمہوریت اور آزادی کے انقلاب کے نتیجہ میں مذہبی اشاعت کی مکمل آزادی، سوویت روس میں میخائیل گورباچیف کی لائی ہوئی تبدیلیوں کے بعد مذہب کے لئے آزادانہ مواقع کھلنا، جدید وسائل اعلام کے ذریعہ یہ ممکن ہو جانا کہ ساری دنیا کے تمام لوگوں تک اسلام کا پیغام حق پہنچایا جاسکے، یہ واقعات واضح طور پر یہ اشارہ کر رہے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بعد کے زمانہ کے لئے اسلام کی عمومی

اشاعت کی جو پیشین گوئی فرمائی تھی، اس کا وقت پوری طرح آچکا ہے۔

خدا نے اپنا کام کر دیا ہے۔ اب اہل ایمان کو اپنے حصہ کا کام کرنا ہے۔ خدا اپنے منصوبہ کے مطابق ضروری مواقع مہیا فرماتا ہے۔ اس کے بعد خدا کے مومن بندے اٹھتے ہیں اور ان مواقع کو استعمال کرکے اس منصوبہ کی تکمیل کرتے ہیں۔

ساتویں صدی میں اسی طرح اللہ تعالیٰ نے ختم شرک کے منصوبہ کے لئے تمام ضروری مواقع جمع کر دئے تھے۔ رسول اور اصحاب رسول نے ان مواقع کو استعمال کرکے خدا کے منصوبہ کو عملی واقعہ بنایا۔ اسی طرح موجودہ زمانہ میں اسلام کی عمومی اشاعت کے لئے اللہ تعالیٰ کا جو منصوبہ ہے، اس کے تمام ضروری اسباب مہیا کر دئے گئے ہیں۔ خدا نے دوبارہ اپنا کام کر دیا ہے۔ اب خدا کے بندوں کو اٹھنا ہے اور پیدا شدہ مواقع اور اسباب کو استعمال کرکے دوبارہ خدا کے منصوبہ کو عملی طور پر مکمل کر دینا ہے۔

خدا کا دین قرآن کی زبان میں آواز دے رہا ہے کہ مَنْ انصاری الی اللّٰہ۔ اہل ایمان کو اس کے جواب میں کہنا ہے کہ نحن انصار اللّٰہ۔ یہ تاریخ کا نازک ترین لمحہ ہے۔ مبارک ہیں وہ لوگ جو اس لمحہ کو پہچانیں اور اپنا سب کچھ اس کی بجاآوری میں لگا دیں۔

امتیازی صفت

اسلام ایک محفوظ مذہب ہے۔ اس لئے اس کے اندر یہ امتیازی صفت پائی جاتی ہے کہ وہ انسانی عقل اور انسانی فطرت کے عین مطابق ہے۔ عقلی غور وفکر یا علمی ترقی کا کوئی بھی درجہ ایسا نہیں جہاں اسلام میں اور عقل میں ٹکراؤ پیش آجائے اور انسان کے سامنے یہ مسئلہ پیدا ہو جائے کہ اگر وہ مذہب کو لیتا ہے تو اس کو علم اور عقل کے تقاضوں کو پہلے چھوڑنا پڑے گا۔

جارج برنارڈ شا نے اسلام کی اس صفت کا اعتراف کرتے ہوئے لکھا ہے کہ جب اسلامی اصلاح کی تحریک اٹھی تو اس کے پیروؤں کو یہ زبردست موقع ملا کہ ان کا مذہب دنیا میں واحد قائم شدہ مذہب تھا جس کے عقائد کو کوئی بھی ذہین اور تعلیم یافتہ آدمی تسلیم کر سکتا تھا:

When the Mahomedan reformation took place, it left its followers with the enormous advantage of having the only established religion in the world, in whose articles of faith, any intelligent and educated person could believe.

اسلام کی اسی خاص صفت کا یہ نتیجہ ہے کہ سائنسی دور سے پہلے کے زمانہ میں بھی لوگ کثرت سے اسلام میں داخل ہوتے رہے اور آج سائنسی دور میں بھی ساری دنیا میں لوگ اسلام میں داخل ہو رہے ہیں۔ جدید تعلیم یافتہ ذہن کے لئے اسلام کو قبول کرنے میں کوئی رکاوٹ نہیں۔ یہاں وہ اس مشکل سوال سے دوچار نہیں ہوتا کہ اسلام کو لے تو علم وعقل کو چھوڑنا پڑے گا اور علم وعقل کو لے تو اسلام کو چھوڑنا ضروری ہو جائے گا۔ اِلّا یہ کہ مصنوعی طور پر وہ اپنے ذہن کے دو خانے بنالے۔ ایک میں اپنے دین کو رکھے اور دوسرے میں اپنے علم کو۔

جارج برنارڈ شا نے جس چیز کو دور اول کے اہل اسلام کے لئے عظیم موقع (enormous advantage) کہا ہے وہ موقع آج کے اہل اسلام کے لئے بھی پوری طرح موجود ہے۔ تاہم وہ استعمال نہیں ہو رہا ہے۔ اس کی راہ میں واحد رکاوٹ وہ قومی نفرت ہے جو داعی اور مدعو کے درمیان غلط طور پر قائم ہو گئی ہے۔ اس رکاوٹ کو اگر دور کر دیا جائے تو دوبارہ اسلام ایک عظیم سیلاب کی مانند انسانی آبادیوں میں داخل ہو جائے گا۔

دعوہ ہاٹ لائن

"ہیلو، کیا کوئی صاحب وہاں ہیں جو میری بات کا جواب دیں۔ میں ایک امریکن یہودی ہوں، اور اسلام کے بارہ میں کچھ جاننا چاہتا ہوں۔ میں نے امریکہ کی کئی مسجدوں میں ٹیلیفون کیا۔ مگر کہیں سے مجھے اطمینان بخش جواب نہیں ملا۔ میں صرف اسلام کے بارہ میں معلومات چاہتا ہوں"

یہ ایک ٹیلیفون کال تھی جو اسلامک سرکل آف نارتھ امریکہ (ICNA) کے دفتر واقع جمیکا میں موصول ہوئی۔ ٹیلیفون پر موجود شخص نے اپنی استطاعت کے مطابق جواب دیا۔ اس کے بعد معلوم ہوا کہ اس طرح کی کالیں اکثر امریکہ کی مسجدوں میں موصول ہوتی ہیں۔ مگر بروقت مسجد میں کسی موزوں شخص کی عدم موجودگی کی وجہ سے کال کرنے والے کو صحیح اور موثر جواب نہیں مل پاتا۔ یا سرے سے وہاں کوئی شخص موجود نہیں ہوتا جو ٹیلیفون کرنے والے کو ضروری اطلاع دے۔

آخر کار یہ واقعہ مذکورہ اسلامک سنٹر (اکنا) کے دفتر میں ہاٹ لائن ٹیلیفون نصب کرنے کا محرک بن گیا۔ ۱۹۹۵ میں یہ منصوبہ مکمل ہو جائے گا۔ اس کا نام دعوہ ہاٹ لائن ہوگا۔ اور اس کا نمبر اس طرح ہوگا: (1-800-662-ISLAM) اس لائن پر کوئی نہ کوئی تربیت یافتہ آدمی ہر وقت موجود رہے گا۔ اور پوچھنے والوں کو اسلام کے بارہ میں ضروری معلومات فراہم کرے گا۔ فی الحال اس مقصد کے لئے مذکورہ مرکز نے دو ہمہ وقتی کارکنوں کی خدمات حاصل کی ہیں جو انگریزی زبان پر قدرت رکھتے ہیں۔ اور اسی کے ساتھ انھوں نے اسلام کا اچھا مطالعہ بھی کیا ہے۔ اس منصوبہ کا ابتدائی خرچ ایک لاکھ ڈالر (۳۰ لاکھ روپیہ) ہے (دعوت، ۱۲ جولائی ۱۹۹۵)

قدیم زمانہ میں داعی کو مدعو کے پاس جانا پڑتا تھا۔ اب موجودہ زمانہ میں ایسی تبدیلیاں ہوئی ہیں کہ مدعو خود داعی کے پاس پہنچ رہا ہے۔ ضرورت ہے کہ دنیا بھر کے شہری مراکز میں ایسے انتظامات کئے جائیں جہاں سے لوگ ٹیلیفون پر اسلام کے بارہ میں معلومات حاصل کرسکیں۔ ہندستان کے بڑے شہروں میں بھی اس کی سخت ضرورت ہے۔ اگر ایسا ہو جائے تو غیر مسلموں کے اعلیٰ طبقہ میں اسلام کا پیغام پہنچنے لگے۔

اشاعت اسلام

ہندو دھرم میں یہ مانا گیا ہے کہ سچائی ایک ہے، مگر اس کے راستے جدا جدا ہیں۔ وہ مختلف مذاہب کو سچائی کے مختلف راستے تصور کرتا ہے۔ چنانچہ ہندو دھرم ہر مذہب کے احترام کی اپیل کرتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ پچھلے ہزار سال سے ہندستان میں مذہب بدلنے کا عمل جاری ہے۔ مگر ہندو دھرم پر عقیدہ رکھنے والوں نے کبھی اس کو برا نہیں مانا، کیوں کہ ان کے عقیدہ کے مطابق، یہ سچائی کی طرف جانے والے ایک راستہ کے بجائے دوسرے راستہ کے ذریعہ سچائی کی طرف اپنا سفر جاری رکھنے کے ہم معنی تھا۔ پنڈت جواہر لال نہرو نے اپنی کتاب ڈسکوری آف انڈیا میں لکھا ہے کہ ہندستان میں مذہب کی تبدیلی پر اگر کوئی اعتراض کرتا ہے تو وہ سیاسی سبب سے ہوتا ہے نہ کہ مذہبی سبب سے۔

ہندو سنسکرتی کی یہ روایت ۱۹۴۷ کے بعد ملک کے کانسٹی ٹیوشن (دستور) میں بھی باقاعدہ طور پر شامل کر دی گئی۔ چنانچہ دستور کی دفعہ ۲۵ میں ملک کے ہر شہری کا یہ ناقابل تنسیخ بنیادی حق قرار دیا گیا ہے کہ وہ جس مذہب کو چاہے مانے، جس مذہب پر چاہے عمل کرے اور جس مذہب کی چاہے تبلیغ کرے۔

اسی آزادانہ فضا کا یہ نتیجہ ہے کہ ۱۹۴۷ سے پہلے بھی ہندستان میں کثرت سے لوگ اسلام قبول کرتے رہے، اور آج بھی ہر روز ملک کے مختلف علاقوں میں لوگ اپنی ضمیر کی آواز کے تحت مسلسل اسلام قبول کر رہے ہیں۔ مثال کے طور پر دہلی کے انگریزی روزنامہ ٹائمس آف انڈیا کے شمارہ ۲۵ جون ۱۹۹۵ میں صفحہ ۱۳ پر نام کی تبدیلی (Change of Name) کے زیر عنوان یہ اعلان شائع ہوا ہے:

> I, Arvind Kumar, son of Shri Prem Kumar, r/o 67/6, Zamrud Pur, Greater Kailash Part-1, New Delhi 110048, by faith Hindu, would hereafter be called as Ateeq and has embraced Islam. (The Times of India, New Delhi, June 25, 1995)

میں اروند کمار ولد شری پریم کمار ساکن زمرد پور، گریٹر کیلاش، نئی دہلی، ہندو مذہب سے تعلق رکھنے والا، اب عتیق کے نام سے پکارا جائے گا، اور میں نے اسلام قبول کر لیا ہے۔

اس طرح کے اعلانات اخباروں میں برابر آتے رہتے ہیں۔ مثلاً ٹائمس آف انڈیا کے شمارہ ۲۲ مارچ ۱۹۹۶ میں شائع شدہ ایک اعلان کے مطابق، مسٹر اکھلیشور کمار ولد مندر کا سنگھ ساکن ۵۵/۴ نیو چندر راول، کملانگر، نئی دہلی نے بتایا کہ انھوں نے اپنا نام بدل لیا ہے۔ اور اب ان کا نیا نام عمران صدیق ہے۔

اسی طرح ٹائمس آف انڈیا کے شمارہ ۲۷ مارچ ۱۹۹۶ میں شائع شدہ ایک اعلان کے مطابق، مسٹر شیام لال ولد سرجی رام، موضع شاہ پور، ڈاک خانہ ہرسولی، ضلع الور (راجستھان) نے اپنا نام اور مذہب تبدیل کر لیا ہے۔ ان کا نیا نام محمد سلیم ہے اور اب ان کا مذہب اسلام ہے۔

اسی شمارہ (ٹائمس آف انڈیا، ۲۷ مارچ ۱۹۹۶) میں چھپنے والے ایک اور اعلان کے مطابق، مسز شاردا بنت مسٹر رمیش، موضع مجری، ڈاک خانہ بہرور، ضلع الور نے اپنا نام سائرہ بیگم رکھ لیا ہے اور ہندو دھرم کو چھوڑ کر اسلام قبول کر لیا ہے۔

اس طرح کے واقعات ہندستان کے مختلف حصوں میں مسلسل ہو رہے ہیں۔ ان میں سے کچھ اخبار میں آتے ہیں، اور بیشتر اخبارات میں نہیں آتے۔ یہ اس بات کا ثبوت ہے کہ ہندستان میں مکمل مذہبی آزادی حاصل ہے۔ یہاں کے ہر شہری کو حق ہے کہ وہ اپنی مرضی کے مطابق جس مذہب کو چاہے چھوڑے اور جس مذہب کو چاہے اختیار کرے۔

حقیقت کی تلاش

لیوس کیرول (Lewis Carrol) ایک برٹش مصنف ہے۔ وہ ۱۸۳۲ میں پیدا ہوا، اور ۱۸۹۸ میں اس کی وفات ہوئی۔ اس نے بچوں کے لئے کچھ کہانیاں لکھی ہیں۔ یہ اتنی دلچسپ ہیں کہ اس کی کہانیوں کی ایک کتاب کو پڑھ کر چھ سال کے ایک بچہ نے کہا کہ میری تمنا ہے کہ اس کی ۶۰ ہزار جلدیں ہوں :

he wished there were 60,000 volumes of it. (3/967)

تاہم لیوس کیرول ایک غمگین آدمی تھا۔ اس نے ساری عمر شادی نہیں کی۔ تنہائی میں زندگی گزار کر مرگیا۔ اس نے کہا کہ میں اس دنیا میں کیا ہوں۔ اُف، یہ ایک عظیم معما ہے :

Who in the world am I? Ah, that's the great puzzle.

یہ اس دنیا میں ہر شخص کا مسئلہ ہے۔ کوئی زیادہ شدت کے ساتھ اس کو محسوس کرتا ہے اور کوئی کم شدت کے ساتھ۔ تاہم کوئی بھی آدمی اس سوال سے خالی نہیں۔

عام جانوروں کا بنیادی مسئلہ صرف دو ہے، غذا اور تحفظ۔ جانور کو اگر یہ دو چیزیں مل جائیں تو اس کے بعد وہ نہایت سکون کے ساتھ سو جائے گا۔ مگر انسان کے اندر اسی کے ساتھ ایک اور چیز کی شدید طلب پائی جاتی ہے۔ اور وہ ہے زندگی کی حقیقت۔

فلسفہ اور سائنس جیسے علوم اس سوال کا تشفی بخش جواب نہیں دیتے۔ کیوں کہ فلسفہ اور سائنس کا علم تو خود انسان نے بنایا ہے۔ یعنی وہی انسان جو حقیقت کی تلاش میں سرگرداں ہے وہی ان علوم کو مرتب کرتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ یہ تمام علوم ناقص ہیں، اور ناقص علم سے کامل جواب حاصل نہیں کیا جاسکتا۔

پیغمبرانہ الہام اسی سوال کا جواب ہے۔ جو آدمی اس کا مطالعہ کرے گا وہ اس میں اپنی طلب کا جواب پالے گا۔ پیغمبرانہ الہام خود اپنی ذات میں صداقت ہے۔ طالب کی بے آمیز فطرت کے سامنے جب یہ ربانی کلام آتا ہے تو خود اس کا اندرونی احساس یہ گواہی دینے لگتا ہے کہ یہ عین وہی چیز ہے جو اس کی فطرت تلاش کر رہی تھی۔ پیغمبر کا الہامی کلام طالب کے لئے اپنی دلیل آپ بن جاتا ہے۔

دعوتی امکان

فرانس کے ڈاکٹر جرینیہ نے اسلام قبول کرلیا ہے ۔ اس سلسلے میں ریاض کے عربی ہفت روزہ الدعوہ میں ان کے بارہ میں حسب ذیل رپورٹ شائع ہوئی ہے :

انني تتبعت كل الأيات القرانية التى لها ارتباط بالعلوم الطبية والصحية والطبيعية التى درستها من صغري واعرفها جيدا فوجدت هذه الأيات منطبقة كل الانطباق على معارفنا الحديثة .. لقد اسلمت لانني تيقنت ان محمدا صلى الله عليه وسلم اتى بالحق الصراح من قبل الف سنة دون معلم اومدرس من البشر ولو ان كل صاحب فن من الفنون اوعلم من العلوم قارن كل الأيات القرانية المرتبطة بمايعلم كمافعلت انا لاسلم بلاشك ان كان عاقلاً خاليا من الاغراض ۔ (الدعوة، الرياض ۹ دسمبر ۸۵ء)

میں نے قرآن کی ان تمام آیات کا تتبع کیا جن کا تعلق مختلف طبیعیاتی علوم سے ہے ، جن کو میں نے کم عمری سے پڑھا ہے اور جن کو میں اچھی طرح جانتا ہوں ۔ میں نے پایا کہ قرآن کی یہ آیتیں ہماری جدید معلومات سے کلی مطابقت رکھتی ہیں ۔ میں نے اسلام قبول کرلیا کیوں کہ مجھے یقین ہوگیا کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم حق لے کر آئے ۔ وہ ہزار سال پہلے پیدا ہوئے انھوں نے کسی استاد سے تعلیم حاصل نہیں کی۔ پھر بھی ان کی ہر بات بالکل صحیح ثابت ہوئی ۔ اور اگر علوم کے ماہرین یہ کریں کہ وہ قرآن کی آیتوں کا اپنی معلومات سے مقابلہ کریں جیسا کہ میں نے کیا ہے تو یقیناً وہ سب اسلام قبول کریں گے، بشرطیکہ وہ اغراض سے خالی ہو کر اسے دیکھیں۔

قرآن کو جب ایک شخص کھلے ذہن کے ساتھ پڑھتا ہے تو وہ محسوس کرتا ہے کہ یہ ایک ایسے مصنف کی کتاب ہے جو "ساتویں صدی" میں بھی "بیسویں صدی" کی باتوں کو جانتا تھا۔ قرآن کا یہ امتیاز واضح طور پر اس بات کا ثبوت ہے کہ قرآن خدائے عالم الغیب کی کتاب ہے ۔ یہ کسی انسان کی بنائی ہوئی کتاب نہیں ۔ قرآن کی یہ استثنائی صفت قرآن کا زندہ معجزہ ہے ۔ قرآن کی دعوت کو اگر آج کے انسان کے سامنے پیش کیا جائے تو قرآن کی یہ صفت اس کے حق میں بہت بڑی معجزاتی تائید ثابت ہوگی ۔ لوگ مجبور ہوں گے کہ اس کو مانیں اور اس پر ایمان لائیں ۔

فکری طاقت

قرآن میں آئندہ آنے والے زمانہ کے بارہ میں جو خبریں دی گئی ہیں ان میں سے ایک پیشگی خبر وہ ہے جو سورہ نمبر ۴۱ میں ان الفاظ میں آئی ہے:

سنریهم ایاتنا فی الآفاق وفی انفسهم حتی یتبین لهم انه الحق۔ اولم یکف بربك انه علی کل شیٔ شهید۔ (حم السجدۃ ۵۳)

عنقریب ہم ان کو اپنی نشانیاں دکھائیں گے، آفاق میں اور انفس میں، یہاں تک کہ ان پر کھل جائے کہ یہ حق ہے۔ کیا یہ تیرے رب کے لیے کافی نہیں کہ وہ ہر چیز پر گواہ ہے۔

اس آیت کے مطابق، نزول قرآن کے بعد وہ زمانہ آنے والا ہے جب کہ فطرت کی نشانیوں کا ظہور ہی تبیینِ حق کے لیے کافی ہو جائے۔ جب کہ کائنات اور انسان کے بارہ میں علمی انکشافات ہی ان حقائق کو ثابت شدہ بنا دیں جن کی خبر قرآن اور صاحب قرآن (صلی اللہ علیہ وسلم) کے ذریعہ اہل عالم کو دی گئی ہے۔

یہی بات حدیث میں ایک اور انداز سے آئی ہے۔ یہاں ہم اس سلسلہ میں صحیح مسلم کی ایک روایت نقل کرتے ہیں:

عن ابی هریرةؓ، ان النبی صلی الله علیه وسلم قال: "هل سمعتم بمدینة جانب منها فی البر وجانب منها فی البحر" قالوا: نعم یارسول الله، قال: "لاتقوم الساعة حتی یغزوها سبعون الفاً من بنی اسحاق، فاذا جاؤوها نزلوا، فلم یقاتلوا بسلاح ولم یرموا بسهم، قالوا: لا اله الا الله والله اکبر، فیسقط احد جانبیها. قال ثور بن زید الراوی: لا اعلمه الا قال: "الذی فی البحر، ثم یقولون الثانیة، لا اله الا الله، والله اکبر، فیسقط جانبها الآخر، ثم یقولون الثالثة، لا اله الا الله، والله اکبر، فیفرج لهم فیدخلونها فیغنمون، فبیناهم یقتسمون المغانم اذ جاءهم الصریخ، فقال: ان الدجال قد خرج، فیترکون کل شیٔ ویرجعون" رواه مسلم۔

حضرت ابوہریرہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ کیا تم نے ایک شہر کے بارہ میں سنا ہے

جس کا ایک رُخ خشکی کی طرف ہے اور اس کا دوسرا رخ سمندر کی طرف ہے۔ لوگوں نے کہا کہ ہاں اے خدا کے رسول۔ آپ نے فرمایا کہ قیامت اس وقت تک نہ آئے گی جب تک بنو اسحاق کے ستر ہزار افراد اس سے جنگ نہ کریں۔ جب وہ لوگ اس شہر تک آئیں گے تو وہ وہاں اتریں گے۔ وہ کسی ہتھیار سے نہ لڑیں گے اور نہ کوئی تیر ماریں گے۔ وہ کہیں گے کہ اللہ کے سوا کوئی الٰہ نہیں اور اللہ سب سے بڑا ہے۔ پس اس کے دو رخوں میں سے ایک رُخ گر جائے گا۔ ثور بن زید (راوی حدیث) نے کہا کہ میں اس کے سوا نہیں جانتا کہ آپ نے فرمایا کہ وہ جو سمندر کی جانب ہے۔ پھر وہ لوگ دوبارہ کہیں گے کہ اللہ کے سوا کوئی الٰہ نہیں اور اللہ سب سے بڑا ہے، پس اس کا دوسرا رُخ گر جائے گا۔ پھر وہ لوگ تیسری بار کہیں گے کہ اللہ کے سوا کوئی الٰہ نہیں اور اللہ سب سے بڑا ہے، پس وہ ان کے لیے کھل جائے گا وہ اس میں داخل ہو جائیں گے اور غنیمت حاصل کریں گے۔ پس جب وہ غنیمت تقسیم کر رہے ہوں گے، اسی اثنا میں پکار سنائی دے گی ـــ کہنے والا کہے گا کہ دجال نکل آیا۔ پس وہ ہر چیز چھوڑ دیں گے اور لوٹ آئیں گے۔

اس روایت کی ذیلی تفصیلات سے ہٹ کر اس کے اصل مدعا کو دیکھئے تو اس کا خلاصہ یہ ہے کہ آئندہ ایسا زمانہ آئے گا جب لاالٰہ الاّ اللہ، اللہ اکبر کہہ دینے سے فتح حاصل ہو گی۔ بالفاظ دیگر، ہتھیار کو استعمال کرنے کی ضرورت نہ ہو گی۔ بلکہ اسلام کی فکری اور نظریاتی طاقت ہی قوموں کو مسخر کرنے کے لیے کافی ہو جائے گی۔

مذکورہ حدیث میں آخری زمانہ کے ایک واقعہ کا ذکر ہے جس کے لیے حدیث میں "غزوہ" کا لفظ استعمال کیا گیا ہے۔ مگر اس کے بعد جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس غزوہ کی تشریح فرمائی تو کہا کہ وہ نہ کسی ہتھیار سے لڑیں گے اور نہ کوئی تیر چلائیں گے۔ وہ صرف لاالٰہ الا اللہ کہیں گے اور ان کے لیے فتح کے دروازے کھلتے چلے جائیں گے۔

اس سے معلوم ہوا کہ "غزوہ" کا مطلب لازمی طور پر جنگ وقتال نہیں ہے۔ فکری اور نظریاتی مہم بھی اسلام کے نزدیک غزوہ ہے۔ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی پیشینگوئی کے مطابق، دور آخر میں غزوہ کی یہی قسم مسلمانوں کے لیے غلبہ اور کامیابی کا سب سے بڑا ذریعہ ہو گی۔

دعوت کی کرامت

غزوۂ خندق ۵ ھ میں پیش آیا۔ ابوسفیان کی سرداری میں دس ہزار مسلح آدمیوں نے مدینہ کو گھیر لیا۔ یہ بڑا سخت موقع تھا۔ اسی کے لئے قرآن میں آیا ہے کہ جب آنکھیں پھر گئیں اور دل گلوں تک پہنچ گئے (الاحزاب ۱۰) مدینہ میں گھبراہٹ کا یہ عالم تھا کہ ایک مسلمان کی زبان سے بے اختیار اس قسم کے الفاظ نکل گئے :

کان محمد یعدنا ان ناکل کنوز کسریٰ وقیصر واحدنا الیوم لایأمن علی نفسہ ان یذھب الی الغائط (سیرۃ النبی لابن ھشام، الجزء الثالث، صفحہ ۲۳۸)

محمد ہم سے وعدہ کرتے تھے کہ ہم کسریٰ اور قیصر کے خزانے حاصل کریں گے اور حال یہ ہے کہ ہم میں سے ایک شخص بیت الخلا جانے کے لئے بھی مامون نہیں۔

رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم جنگ اور امن ہر حال میں دشمن کی سرگرمیوں کی خبر معلوم کرتے رہتے تھے۔ چنانچہ جب یہ عظیم فوج مکہ سے روانہ ہوئی تو مدینہ میں آپ کو اس کی خبر ہوگئی۔ آپ نے لوگوں کو مشورہ کے لیے جمع کیا۔ اور ان سے پوچھا کہ بتاؤ ایسی حالت میں اپنے بچاؤ کے لئے کیا کیا جائے۔

اس وقت حضرت سلمان فارسی نے مشورہ دیا کہ مدینہ کے کنارے خندق کھودی جائے۔ مدینہ کے ایک طرف کھجوروں کے گھنے باغات نے قدرتی دیوار قائم کر رکھی تھی۔ شمال مشرق سے شمال مغرب تک کا حصہ کھلا ہوا تھا۔ اسی حصہ میں خندق کھودی گئی۔ کہا جاتا ہے کہ خندق کی لمبائی تقریباً پانچ ہزار ہاتھ تھی۔ گہرائی سات ہاتھ سے دس ہاتھ تک اور چوڑائی تقریباً دس ہاتھ۔

ابن کثیر نے طبری اور سہیلی کے حوالہ سے لکھا ہے کہ پہلا شخص جس نے خندق کھودی وہ فارس کا بادشاہ منوچہر بن فریدوں تھا۔ وہ حضرت موسیٰ کا ہم عصر تھا۔ حضرت سلمان فارس کے رہنے والے تھے مشورہ کے وقت انھوں نے بتایا کہ اے خدا کے رسول، اہل ایران کا یہ طریقہ ہے کہ جب گھوڑ سوار لشکر کے حملہ کا ڈر ہوتا ہے تو وہ اس کے مقابلہ کے لئے خندق کھودتے ہیں۔ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے اس رائے کو پسند فرمایا اور خود صحابہ کے ساتھ شریک ہوکر خندق کھودی۔

"خندق" کا لفظ اصلاً فارسی سے آیا ہے۔ اس کی اصل کندہ (کھودا ہوا) ہے۔ کندہ سے کندک اور خندک بنا جو عربی زبان میں خندق ہوگیا۔ اس وقت تک اہل عرب میں یہ طریقہ بالکل غیر معروف تھا۔ چنانچہ

مکہ والوں کے سرداروں نے جب اس کو دیکھا تو کہا:

واللہ ان ھذہ لمکیدۃ ما کانت العرب تکیدھا (سیرۃ ابن ہشام، الجزء الثالث، صفحہ ۲۴۰)

خدا کی قسم یہ ایک ایسی تدبیر ہے جس تدبیر کو عرب استعمال نہیں کرتے تھے۔

اس واقعہ میں سوچنے کی بات یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے اصحاب بھی عرب تھے اور وہ لوگ بھی عرب تھے جنھوں نے مکہ سے آکر آپ کے اوپر چڑھائی کی تھی۔ پھر کیا وجہ ہے کہ مسلمانوں کو ایسا شخص مل گیا جو ان کو فارسی خندق کا طریقہ بتائے۔ اور مکہ کے مشرکین کو فارسی خندق کا طریقہ بتانے والا نہیں ملا۔

اس فرق کی وجہ دعوت تھی۔ مشرکین مکہ کا معاشرہ ایک جامد معاشرہ تھا۔ اس میں باہر سے کوئی اضافہ ممکن نہ تھا۔ جب کہ مسلمانوں کا معاشرہ ایک اضافہ پذیر معاشرہ تھا جس میں ہر آن تبلیغ کے ذریعہ مزید انسانی صلاحیتیں شامل ہوتی جارہی تھیں۔ اسلام کا یہی خاص ایڈوانٹج تھا جس کی بنیاد پر اس کو ایک سلمان فارسی مل گیا جو اس کو فارسی طریقہ بتائے۔ اس کے برعکس مشرکین مکہ کسی سلمان فارسی کو نہ پاسکے جو ان کو عرب سے باہر کے طریقوں کی خبر دے۔

تاریخ کی کتابوں میں یہ دونوں واقعات الگ الگ لکھے ہوئے ہیں۔ مسلمانوں کا خندق سے باخبر ہو کر مدینہ کے گرد خندق کھودنا۔ اور مشرکین مکہ کا خندق کی تدبیر سے بے خبر رہنا۔ ان دونوں واقعات کو الگ الگ پڑھئے تو آپ کو ان سے کوئی نصیحت نہیں ملے گی۔ مگر جب ان دونوں واقعات کو مربوط کریں، جب ان کو ایک دوسرے سے ملا کر دیکھیں تو اچانک ایک عظیم سبق کا انکشاف ہوتا ہے۔ یہ کہ دعوت اس دنیا میں سب سے بڑی قوت ہے۔ وہ اپنی قوت پر دوسروں کی قوت کا اضافہ ہے۔

دعوت کے بغیر معاشرہ ایک جامد چٹان ہے۔ مگر دعوت کے اضافہ کے بعد معاشرہ ایک سیلاب بن جاتا ہے۔ ایسا سیلاب جو بڑھتا ہی رہے۔ ایسا سیلاب جو سارے جغرافیہ ارضی میں پھیل جائے۔ اسلام کی تاریخ اس نظریہ کی واقعاتی تصدیق ہے۔ مسلمان جب تک دنیا میں داعی گروہ کی حیثیت سے رہے، وہ ساری دنیا میں پھیلتے رہے۔ اسلام قطرہ سے سمندر بنتا رہا۔ مگر جب مسلمانوں نے داعی گروہ کی حیثیت کھو دی تو ان کا معاشرہ بھی جامد معاشرہ بن کر رہ گیا۔

تاریخ کی زبان سے

قرآن میں ارشاد ہوا ہے: تم منکروں کی بات نہ مانو اور ان کے ساتھ جہاد کرو، بڑا جہاد (فلا تطع الکافرین وجاھدھم بہ جھادا کبیرا، فرقان ۵۲)

یہ سورہ الفرقان کی آیت ہے۔ سورہ الفرقان بالاتفاق مکی سورہ ہے۔ مکی دور میں قتال کا حکم نہیں اترا تھا بلکہ صراحتہً اس سے روکا گیا تھا (کفوا ایدیکم واقیموا الصلاۃ، نساء ۷۷) اس لئے یہاں جہاد کو لازماً غیر حربی مفہوم میں لینا ہوگا۔ حضرت عبداللہ بن عباس نے بہ کی ضمیر کا مرجع قرآن لیا ہے اور وجاھدھم بہ کی تفسیر جاھدھم بالقرآن سے کی ہے (تفسیر ابن کثیر) اس تفسیر کے مطابق آیت کا مطلب یہ ہے کہ قرآن کی دعوت پیش کرنے میں پوری کوشش کرو۔ قرآن کی نظریاتی اشاعت کے ذریعہ باطل کا مقابلہ کرو۔

جہاد کا لفظ قرآن کے دوسرے مقامات پر جنگ وقتال کے لئے بھی آیا ہے۔ مگر ایسے مقامات پر صرف جہاد کا لفظ ہے۔ مگر سورہ فرقان میں جس عمل کا ذکر ہے اس کو "جہاد کبیر" سے تعبیر کیا گیا ہے، اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ خدا کی نظر میں سب سے بڑا جہاد وہ نہیں ہے جو میدان جنگ میں ہتھیاروں کے ذریعہ ہوتا ہے۔ سب سے بڑا جہاد وہ ہے جو قرآنی پیغام کی تبلیغ واشاعت کے ذریعہ انجام دیا جاتا ہے۔

اسلام کا اصل مقصد لوگوں سے لڑنا نہیں بلکہ لوگوں کو خدا کی رحمت کے سایہ میں لانا ہے۔ لڑائی اسلام کا ایک اتفاقی عمل ہے جب کہ دعوت اسلام کا اصلی اور دائمی عمل۔ مومن دوسروں کے حق میں حد درجہ خیر خواہ ہوتا ہے۔ وہ چاہتا ہے کہ خدا کے بندوں کو جہنم کے خطرے سے بچائے اور ان کو جنت کے راستہ پر لگائے۔ یہ کام سنجیدہ تبلیغ اور حکیمانہ نصیحت کے ذریعہ ہوتا ہے نہ کہ لڑائی بھڑائی کے ذریعہ۔ نیز خارجی دنیا میں فتح کی اصل جڑ بھی دلوں کی فتح ہے۔ لوگوں کے دلوں پر قبضہ حاصل ہو جائے تو گویا ان کی ساری چیز قبضہ میں آگئی۔ تلوار کے ذریعہ حاصل کی ہوئی فتح عارضی اور جزئی ہوتی ہے اور دل کی راہ سے حاصل کی ہوئی فتح مستقل اور مکمل ہوتی ہے۔ اگر آپ نے جنگ کا میدان جیتا تو آپ نے صرف ایک "میدان" جیتا۔ لیکن اگر آپ نے دلوں کو جیت لیا تو آپ نے پوری قوم اور اس کے سارے اثاثہ کو جیت لیا۔

جو چیز حکمت سے حاصل ہو سکتی ہے اس کو جبر سے حاصل کرنے کی کوشش کرنا صرف یہ خطرہ مول لینا ہے کہ وہ کبھی حاصل نہ ہو۔ حضرت عمر کی خلافت کے زمانہ میں حساب کتاب کا نظام قائم ہوا تو دفاتر کے لئے وہی اجنبی زبانیں اختیار کر لی گئیں جو پہلے سے مفتوحہ ممالک میں رائج تھیں۔ مثلاً ایران کے لئے فارسی، شام کے لئے سریانی، مصر کے لئے قبطی۔ اگر اول دن سے عربی زبان پر اصرار کیا جاتا تو غیر ضروری قسم کے لڑائی جھگڑے شروع ہو جاتے جو کبھی ختم نہ ہوتے۔ مگر مقامی زبانیں اختیار کرنے کا نتیجہ یہ ہوا کہ اسلام اور عربیت کی اشاعت

کا پرامن عمل اپنی فطری رفتار سے جاری رہا۔ یہاں تک کہ بالآخر یہ تمام علاقے عرب علاقے بن گئے اور سب کی زبان عربی زبان ہوگئی۔

اسلام کی اصل طاقت تلوار نہیں، اسلام کی اصل طاقت تبلیغ ہے۔ اس سلسلے میں یہاں ماسٹر تارا سنگھ (۱۹۶۷ — ۱۸۸۵) کا ایک بیان نقل کیا جاتا ہے:

جب کوئی مجھ سے یہ کہتا ہے کہ حضرت محمد صاحب نے تلوار کے زور سے اپنا مذہب پھیلایا تھا تو مجھے اس شخص کی ناسمجھی پر ہنسی آتی ہے۔ اس اعتراض کرنے والے کو معلوم ہونا چاہئے کہ اس اعتراض سے تو وہ محمد صاحب کو غیبی طاقت کا مالک تسلیم کر رہا ہے۔ اگر ایک تنہا محمدؐ دنیا کے مقابلہ میں تلوار سے کامیاب ہوتا ہے تو یقیناً یہ ایک معجزہ ہے۔ اپنی سچائی اور ایمان داری کی مدد سے کامیابی حاصل کرنا اتنا بڑا معجزہ نہیں جتنا کہ تلوار کے زور سے مذہب پھیلانے میں کامیابی حاصل کرنا۔

فرض کیا جائے کہ محمد نے پہلا، پھر دوسرا، پھر تیسرا، پھر چوتھا مسلمان تلوار کے زور سے ہی بنایا تھا تو یہ اشخاص جبراً مسلمان کئے جانے کی وجہ سے محمدؐ کے دشمن ہو گئے ہوں گے۔ ایک ایک کو تو تلوار کے زور سے محمد صاحب مسلمان کر سکتے تھے۔ لیکن جب وہ تین چار اکھٹے ہوئے تھے تو انھوں نے کیوں محمد صاحب سے بدلہ نہ لیا۔ اگر اس بات کا جواب یہ دیا جائے کہ وہ مسلمان تو تلوار کے زور سے ہی ہوئے تھے لیکن بعد میں وہ محمد صاحب پر صدق دل سے ایمان لے آئے تھے، تو یہ ایک فضول سی بات ہے جسے کوئی ماننے کو تیار نہ ہوگا کہ جس پر جبر کیا جائے وہی بعد میں دوست بن جائے۔ ایسی بھدی دلیل کے یہ معنی ہیں کہ کوئی ایک شخص جو جسمانی طور پر دوسروں سے طاقت ور ہے ایک ایک کو فتح کرنے کے بعد اپنا مذہب پھیلا سکتا ہے۔ یہ ایک ایسی مہمل دلیل ہے کہ اس پر مزید بحث کی ضرورت نہیں۔

مسلمانوں نے بعض موقعوں پر مذہب کی مدد کے لئے تلوار کا استعمال ضرور کیا تھا۔ لیکن اس بات کی ذمہ داری حضرت محمد صاحب پر نہیں آسکتی۔ جو شخص مذہب کے نام پر تلوار کی جنگ میں شریک ہوتا ہے اور اس طرح اپنے آپ کو خطرہ میں ڈالتا ہے اس کا ایمان بھی کافی حد تک مضبوط ہوتا ہے۔ یقین کی پختگی کے بغیر کوئی شخص اپنے آپ کو جنگ کے خطرہ میں نہیں ڈالے گا۔ اس لئے تلوار چلانے کے لئے بھی تو پہلے یقین کرنے والے مضبوط دلوں کی ضرورت ہے جو صرف وعظ سے پیدا ہو سکتے ہیں۔ تلوار بھی وعظ سے پیدا ہوئے یقین کے بغیر نہیں اٹھائی جا سکتی (رسول نمبر رسالہ مولوی دہلی)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں مصر ایک غیر مسلم ملک تھا۔ وہاں عیسائی اور مشرک قومیں بستی تھیں۔ وہاں کی زبان قبطی تھی۔ اس کے بعد مصر کو مسلمانوں نے فتح کیا۔ مصر نہ صرف سیاسی اعتبار سے فتح ہوا بلکہ سارا مصر

مسلمان ہوگیا۔ وہاں کی زبان بدل کر عربی زبان ہوگئی۔ ایسا کیوں کر ہوا۔ عام آدمی جس نے تاریخ کا گہرا مطالعہ نہ کیا ہو وہ کہہ دے گا کہ یہ تلوار کے ذریعہ ہوا۔ مگر ایسا نہیں ہے۔ مصر کو اور مصریوں کو جس نے فتح کیا وہ عربی تلوار نہیں تھی بلکہ عربی قرآن تھا۔ یہ ایک ایسی تاریخی حقیقت ہے جس کو غیر مسلم محققین نے بھی تسلیم کیا ہے۔ سر آرتھر کیتھ ایک مشہور انگریز مورخ ہے۔ اس نے مصر کی قدیم تاریخ کا نہایت گہرا مطالعہ کیا ہے۔ اس نے مصر میں اسلام کی کامیابیوں کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ مصریوں کو جس چیز نے فتح کیا وہ تلوار نہیں تھی بلکہ قرآن تھا:

The Egyptians were conquered not by the sword, but by the Koran (303)

پروفیسر آرنلڈ کی کتاب دی پریچنگ آف اسلام (۱۸۹۶) خاص اسی موضوع پر لکھی گئی ہے۔ انھوں نے اسلام کی دعوتی تاریخ پیش کرتے ہوئے دکھایا ہے کہ کس طرح اسلام اپنے نظریات کے زور سے پھیلتا رہا۔ یہاں اس کتاب کے چند اقتباسات نقل کئے جاتے ہیں:

"پیغمبر محمد کے پیرو پیغمبر کی موت کے صرف ایک سو سال میں رومن ایمپائر سے بھی زیادہ بڑی سلطنت کے مالک بن چکے تھے۔ بعد کی صدیوں میں اگرچہ عظیم مسلم سلطنت کے ٹکڑے ہوگئے اور اسلام کی سیاسی طاقت کم زور پڑ گئی۔ تاہم اس کی روحانی فتوحات بغیر کسی وقفہ کے جاری رہیں:

Still its spiritual conquests went on uninterruptedly (2)

جب منگول قبائل نے ۱۲۵۸ء میں بغداد کو تباہ کیا اور عباسی خلافت کی عظمت کو خون کے دریا میں بہا دیا۔ جب ۱۲۳۶ء میں فرڈیننڈ نے مسلمانوں کو قرطبہ و غرناطہ سے نکال دیا جو اسپین میں اسلام کا آخری مرکز تھا تو عین اسی وقت اسلام نے سماترا اور ملایا میں اپنے لئے زمین حاصل کر لی۔ اپنے سیاسی تنزل کے زمانہ میں اسلام نے اپنی بعض انتہائی نمایاں روحانی فتوحات حاصل کی ہیں:

In the hours of its political degradation, Islam has
achieved some of its most brilliant spiritual conquests

سلجوقی ترکوں نے گیارھویں صدی عیسوی میں اور منگولوں نے تیرھویں صدی عیسوی میں قومی پیمانہ پر اسلام قبول کر لیا۔ یہ دونوں کے دونوں اسلام کے فاتح تھے مگر فاتحین نے اپنے مفتوحوں کے دین کو قبول کر لیا:

in each case the conquerors have accepted the religion of the conquered

بغیر کسی دنیوی اور مادی طاقت کے مسلمان مبلغین اپنے دین کو وسط افریقہ، چین اور ایسٹ انڈیز جزائر تک پہنچانے میں کامیاب ہو گئے:

Unaided by the temporal power, Muslim missionaries have carried
their faith into Central Africa, China and the East Indies Islads (2)

شاہ کلید

ایک عربی پرچہ میں ایک مضمون نظر سے گزرا۔ اس کا عنوان تھا: المفتاح العظیم (عظیم کنجی) اس میں بتایا گیا تھا کہ دعوت اسلام کی سب سے بڑی طاقت ہے۔ ماضی میں اسلام نے دعوت کے ذریعہ عالمی فتح حاصل کی تھی، آج بھی ہم دعوت کے ذریعہ دوبارہ اپنی شکست کو فتح میں تبدیل کر سکتے ہیں۔

مسلمانوں کے اکثر لکھنے اور بولنے والے اسی طرح آجکل دعوت کی باتیں کر رہے ہیں۔ مگر عین اسی کے ساتھ یہ تمام لوگ مسلمانوں کے خلاف غیر مسلم اقوام کی سازشوں اور دشمنیوں کا بھی اعلان کرتے رہتے ہیں۔ ایک طرف وہ مسلمانوں سے کہہ رہے ہیں کہ تم لوگ داعی بنو۔ اسی کے ساتھ وہ مسلمانوں سے مزید شدت کے ساتھ یہ بھی کہتے رہتے ہیں کہ دنیا کی قومیں تمہارے لئے ظالم بھیڑیا بن گئی ہیں، اس لئے ان سے لڑکر ان کا خاتمہ کرو۔

یہ دونوں باتیں ایک ساتھ کہی جاتی ہیں، مگر وہ ایک دوسرے کی ضد ہیں۔ ایک اگر دعوت ہے تو دوسری عداوت۔ غور کیجئے کہ وہ لوگ کون ہیں جن کو ظالم اور سازشی بتایا جاتا ہے۔ یہ وہی غیر مسلم قومیں ہیں جن کے اوپر ہمیں دعوت کا کام کرنا ہے۔ وہ ہمارے لئے مدعو کی حیثیت رکھتی ہیں۔ گویا مسلمان داعی ہیں اور ان کی پڑوسی غیر مسلم قومیں مدعو۔ اب اگر داعی کے دل میں یہ بٹھایا جائے کہ مدعو تمہارے لئے ظالم بھیڑیا ہے تو کیا وہ سچے داعیانہ جذبہ کے ساتھ اپنے مدعو کے اوپر دعوت کا عمل جاری کر سکتا ہے۔ کیا وہ انی لکم ناصح کی نفسیات کے ساتھ اس سے معاملہ کر سکتا ہے۔

دعوت سرتاسر محبت کا ایک عمل ہے۔ داعی کو آخر حد تک اپنے مدعو کی ہدایت کا حریص بننا پڑتا ہے، اس کے بعد ہی دعوت کے عمل کا آغاز ہوتا ہے۔ مدعو اگر زیادتی کرے تب بھی داعی اس کی زیادتیوں کو بھلا کر یک طرفہ طور پر اس کو اپنی دلچسپی کا موضوع بناتا ہے۔ وہ اپنے دل کو مدعو کی شکایات سے اتنا زیادہ خالی کرتا ہے کہ اس کے دل سے مدعو کے حق میں دعائیں نکلنے لگیں۔

لوگ دعوت کی باتیں کرتے ہیں مگر وہ اس کے آداب نہیں جانتے۔ لوگ داعی کا مقام حاصل کرنا چاہتے ہیں، بغیر اس کے کہ وہ اس کے تقاضے کو پورا کریں۔ لوگ شہادت علی الناس کا کریڈٹ لینا چاہتے ہیں، بغیر اس کے کہ انھوں نے اس کی قیمت ادا کی ہو۔

یہ صرف ان ملکوں کا معاملہ نہیں جہاں مسلمان کمزور اقلیت ہیں۔ ٹھیک یہی نفسیات ان ملکوں کے مسلمانوں کی بھی ہے جہاں انھیں اکثریت حاصل ہے یا جہاں پوری کی پوری آبادی مسلمان ہے۔ فرق صرف یہ ہے کہ اقلیتی علاقہ کے مسلمانوں کو مقامی غیر مسلم طاقت سے شکایت ہے۔ اور اکثریتی علاقہ کے مسلمانوں کو عالمی غیر مسلم طاقتوں سے۔ مثلاً یہودی، عیسائی، اشتراکی مستعمرین، مستشرقین وغیرہ۔

اسلام میں دعوت کی مصلحت ہر دوسری مصلحت پر مقدم ہے۔ دعوت کے مفاد کی خاطر ہر دوسری چیز کو نظر انداز کیا جا سکتا ہے، خواہ وہ بذات خود کتنی ہی زیادہ سنگین اور کتنی زیادہ اہم کیوں نہ ہو۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت اس معاملہ میں اتنی واضح رہنمائی کرتی ہے کہ طالب حق کے لئے ادنیٰ شبہہ کی کوئی گنجائش نہیں۔

ہجرت سے کچھ پہلے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم طائف گئے۔ وہاں کے لوگوں نے آپ کے ساتھ حد درجہ توہین و تذلیل کا سلوک کیا جس کی تفصیل سیرت کی کتابوں میں موجود ہے۔ حتی کہ آپ نے خود حضرت عائشہ سے فرمایا کہ طائف کے دن سے زیادہ سخت دن میرے اوپر کوئی اور نہیں گزرا۔ روایات بتاتی ہیں کہ جب آپ غم اور تکلیف کے ساتھ طائف سے واپس ہوئے تو راستہ میں اللہ کے حکم سے ملک الجبال (پہاڑوں کا فرشتہ) آپ کے پاس آیا۔ اس نے کہا کہ اللہ نے آپ کی قوم کی باتیں سنیں۔ میں ملک الجبال ہوں۔ اگر آپ کہیں تو میں ان دونوں پہاڑوں کے ذریعہ اس بستی کو کچل ڈالوں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ نہیں، میں امید رکھتا ہوں کہ اللہ ان کی اگلی نسلوں سے ایسا شخص پیدا کرے گا جو اللہ کی عبادت کرے اور اس کے ساتھ کسی چیز کو شریک نہ ٹھہرائے (ارجو ان یُخرج اللہ من اصلابھم مَن یعبد اللہ لا یشرک بہ شیئاً، السیرۃ النبویۃ لابن کثیر، الجلد الثانی، صفحہ ۱۵۳)

دعوت بلاشبہہ مفتاح عظیم ہے، مگر اس مفتاح عظیم کو استعمال کرنے کے لئے قلب عظیم درکار ہے۔ اس کے لئے وہ کردار مطلوب ہے جس کو قرآن میں بلند اخلاق (خلق عظیم) کہا گیا ہے۔ قلب عظیم کے بغیر کوئی آدمی نہ تو دعوت کے امکانات کو جان سکتا ہے اور نہ اس کے بغیر وہ اس قابل ہو سکتا کہ وہ ان امکانات کو استعمال کر سکے۔

اللہ تعالیٰ نے اہل اسلام کے لئے دعوت کو ابدی طور پر مفتاح عظیم بنادیا ہے۔ اسلامی تاریخ کے دور اول میں مسلمانوں کو جو کچھ حاصل ہوا، دعوت کے ذریعہ حاصل ہوا۔ آج بھی انھیں جو کچھ ملے گا، دعوت کے ذریعہ ملے گا۔

مزید یہ کہ یہ مفتاح عظیم موجودہ زمانہ میں مفتاح اعظم بن چکی ہے۔ رسول اور اصحاب رسول کے ذریعہ عالمی تاریخ میں جو انقلاب آیا اور جس کے اثرات آج تک جاری ہیں، اس نے دعوت کے عمل کو ہمیشہ سے زیادہ آسان اور ہمیشہ سے زیادہ طاقت ور بنادیا ہے۔

موجودہ زمانہ میں صرف یہ نہیں ہوا ہے کہ جدید وسائل اعلام نے دعوت کی اشاعت و توسیع کے نئے دروازے کھول دئے ہیں۔ اس سے بھی زیادہ بڑی بات یہ ہے کہ علوم کے ارتقاء اور سائنسی تحقیقات نے اسلام کی حقانیت کو مزید ثابت شدہ بنادیا ہے۔ آج اسلام کی صداقت خالص عقلی سطح پر ایک مسلمہ صداقت بن چکی ہے۔ ہمارے اسلاف نے جو کام "عسر" کے حالات میں کیا، اب وقت آگیا ہے کہ اس کام کو "یسر" کے حالات میں انجام دیا جائے۔

دعوت اہل اسلام کے لئے شاہ کلید ہے، مگر وہ شاہ کلید اس وقت ہے جب کہ اس کو اس کے تمام آداب و شرائط کے ساتھ انجام دیا جائے۔

حق کی طاقت

ابرہہ (Abrames) قدیم یمن (جنوبی عرب) کا حبشی عیسائی حکمراں تھا۔ اس نے یمن کے دارالسلطنت صنعا میں ایک بہت بڑا مسیحی کلیسا (Ekklesia) بنایا۔ چونکہ جزیرہ عرب کا سب سے زیادہ مقدس عبادت خانہ کعبہ کو سمجھا جاتا تھا اور زیادہ تر لوگ اسی کی زیارت کے لیے جایا کرتے تھے، ابرہہ نے چاہا کہ وہ کعبہ کو ڈھادے تاکہ تمام لوگ اس کے بنائے ہوئے عبادت خانہ میں آئیں، اور اس طرح عرب کا مذہبی مرکز مکہ سے صنعا کی طرف منتقل ہو جائے۔

اس منصوبہ کے مطابق، ابرہہ ۵۷۰ء میں یمن سے مکہ کے لیے روانہ ہوا۔ اس کا لشکر ۶۰ ہزار مسلح آدمیوں پر مشتمل تھا۔ اس کے ساتھ ایک درجن ہاتھی تھے جو آگے آگے چل رہے تھے۔ اس واقعہ کی تفصیلات بہت لمبی ہیں۔ خلاصہ یہ کہ مکہ کے سردار عبدالمطلب کو جب معلوم ہوا کہ اس قسم کا بے پناہ لشکر کعبہ کو ڈھانے کے لیے مکہ کی طرف بڑھ رہا ہے تو انھوں نے محسوس کیا کہ وہ خود اس سے مقابلہ کی طاقت نہیں رکھتے۔ چنانچہ انھوں نے بیت اللہ میں داخل ہو کر اللہ سے دعائیں کیں۔ اس سلسلہ میں ان کے بہت سے اشعار کتابوں میں آئے ہیں، ان کا ایک شعر یہ تھا:

یَا رَبِّ لَا اَرْجُو لَهُمْ سِوَاكَا   یَا رَبِّ فَامْنَعْ مِنْهُمْ حِمَاكَا

(اے میرے رب، ان کے مقابلہ میں تیرے سوا میں کسی سے امید نہیں رکھتا، اے میرے رب، تو ان سے اپنے حرم کی حفاظت کر) اس طرح عبدالمطلب نے کعبہ کو اللہ کے حوالے کیا اور قبیلہ کے دوسرے لوگوں کے ساتھ بستی سے نکل کر پہاڑوں میں چلے گیے اور وہاں چھپ کر بیٹھ گیے۔

ابرہہ اپنے لشکر کے ساتھ بڑھتا رہا۔ یہاں تک کہ جب وہ حدودِ حرم پر پہونچا تو اس کے ہاتھی نے آگے بڑھنے سے انکار کر دیا۔ اس کو مار مار کر زخمی کر دیا گیا مگر وہ آگے نہ بڑھا۔ اسی دوران بے شمار چڑیوں کے جھنڈ فضا میں ظاہر ہوئے۔ ان کے چونچ اور ان کے پنجوں میں کنکریاں تھیں۔ انھوں نے یہ کنکریاں ابرہہ کے لشکر پر گرائیں تو وہ گولیوں کی بارش کی مانند ان پر برسنے لگیں۔ ابرہہ سمیت پورا لشکر بھس کی طرح چورا چورا ہو کر رہ گیا۔ یہ واقعہ مکہ کے قریب وادی محسر میں پیش آیا۔

اس واقعہ کے بعد عربوں نے قدیم رواج کے مطابق بہت سے اشعار لکھے اور ان میں اپنے

جذبات اور مشاہدات کا اظہار کیا۔ ابو قیس بن الاسلت کا ایک شعر یہ ہے :

فلمّا اتاکم نصر ذی العرش ردّھم جنود الملیک بین ساف وحاصب

پھر جب تمہارے پاس عرش والے کی مدد آگئی تو اس بادشاہ کے لشکر (پرندوں) نے ان کو مٹی اور اور پتھر سے مار کر پسپا کر دیا (سیرۃ ابن ہشام، الجزء الاول۔ صفحہ ۶۲)

ابرہہ کا مذکورہ واقعہ ۵۷۰ء میں پیش آیا تھا۔ اس کے ٹھیک ۵۸ سال بعد ۶۲۸ء میں اسی مکہ کی سرحد پر ایک اور واقعہ اس سے مختلف صورت میں پیش آیا۔ یہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کا وہ واقعہ ہے جو اسلامی تاریخ میں صلح حدیبیہ کے نام سے مشہور ہے۔

اس وقت رسول اللہ علیہ وسلم اپنے دارِ ہجرت (مدینہ) میں تھے۔ ایک خواب کے مطابق آپ اپنے تقریباً ڈیڑھ ہزار اصحاب کے ساتھ عمرہ کے ارادہ سے مکہ کے لیے روانہ ہوئے۔ آپ مکہ کے قریب حدیبیہ کے مقام پر پہونچے تھے کہ مکہ کے قریش نے آگے بڑھ کر آپ کو روکا۔ انھوں نے کہا کہ ہم آپ کو مکہ میں داخل نہیں ہونے دیں گے۔ آپ عمرہ کیے بغیر مدینہ واپس جائیں۔

قریش کا آپ کو عمرہ سے روکنا یقینی طور پر ظلم اور سرکشی کا واقعہ تھا۔ بظاہر دیکھئے تو یہاں قریش مکہ بدلی ہوئی صورت میں وہی کردار ادا کر رہے تھے جو ۵۸ سال پہلے ابرہہ نے ادا کیا تھا۔ اب بظاہر یہ ہونا چاہیے تھا کہ جس طرح ابرہہ کے اوپر خدا نے آسمانی سزا بھیجی اسی طرح دوبارہ قریش کے اوپر آسمانی سزا آتی اور انھیں تباہ کر دیتی تاکہ وہ رسولؐ اور اصحاب رسولؐ کی راہ میں رکاوٹ نہ بنیں۔

مگر ایسا نہیں ہوا۔ پھر اس فرق کا سبب کیا ہے۔ اس فرق کا کم از کم ایک سبب یہ ہے کہ ابرہہ کے حملہ کے وقت فریق ثانی کے پاس وہ نظریاتی ہتھیار موجود نہ تھا جو پیغمبر اسلامؐ کے ساتھ حدیبیہ کے واقعہ کے وقت موجود تھا۔

ابرہہ کے حملہ کے وقت ابھی قرآن کا نزول نہیں ہوا تھا۔ مگر اس کے ۵۸ سال بعد جب حدیبیہ کا واقعہ پیش آیا، اس وقت پیغمبر آخر الزماں مبعوث ہو چکے تھے۔ اور ان کے ذریعہ سے اللہ تعالیٰ نے اپنا سچا دین قرآن کی صورت میں بھیج دیا تھا۔

اللہ تعالیٰ کا یہ وعدہ ہے کہ وہ دین کی اور اہل دین کی حفاظت فرمائے گا۔ تاہم ابرہہ کے زمانہ

میں اللہ تعالیٰ نے دین کی حفاظت کا انتظام اس طرح کیا کہ حق کے دشمنوں پر آسمان سے پتھر برسائے۔
مگر پیغمبر آخرالزماں کی بعثت کے بعد اب صورت حال بدل چکی تھی۔ اب اہل حق کے پاس دینِ فطرت کی صورت میں وہ طاقت ور ہتھیار موجود ہے جس کے آگے کوئی مخالفانہ ہتھیار کارگر نہیں ہو سکتا۔ یہ دین لوگوں کے دلوں اور دماغوں پر حملہ کرتا ہے۔ وہ دشمن کو دوست کے روپ میں بدل دیتا ہے۔ وہ انسان کو اندر سے مسخر کرنے کی طاقت رکھتا ہے۔ یہ دین بلا شبہ سب سے بڑا ہتھیار ہے۔ اور جب آدمی کے پاس بڑا ہتھیار ہو تو چھوٹا ہتھیار استعمال کرنے کی ضرورت نہیں۔

یہی وجہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب حدیبیہ میں قریش سے دس سال کا ناجنگ معاہدہ کر کے لوٹے تو قرآن میں یہ آیت اتری کہ خدا نے تم کو کھلی فتح دے دی اور تم کو نصرِ عزیز سے سرفراز فرمایا (الفتح) چنانچہ اس کے صرف دو برس بعد لوگوں نے دیکھا کہ جو لوگ اسلام کے دشمن بنے ہوئے تھے، وہ اسلام کے دوست اور اس کے دست و بازو بن گئے ہیں۔

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کے مشن کے خلاف جو لوگ سرکشی کر رہے تھے، ان کے بارہ میں قرآن میں کہا گیا ــــــ بلکہ ہم حق کو باطل پر ماریں گے تو وہ اس کا سر توڑ دے گا اور دفعۃً وہ جاتا رہے گا (الانبیاء ۱۸) چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ عبدالمطلب کے زمانہ میں ابرہہ کے لشکر کو پتھروں سے مار کر ہلاک کیا گیا تھا، پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں سرکشی کرنے والوں کو خود حق کی ضرب سے مفتوح اور مغلوب کر دیا گیا۔ اور یہ ایک حقیقت ہے کہ فکری اور نظریاتی شکست، فوجی شکست سے کہیں زیادہ سخت ہے۔

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت ایک جاری نبوت ہے۔ وہ قیامت تک باقی رہے گی۔ اس دوسرے دور میں حق کے مخالفین کو زیر کرنے کے لیے انھیں کنکر پتھر مارنے کی ضرورت نہیں۔ اہل حق کو چاہیے کہ وہ حق لے کر اٹھیں جس طرح پیغمبر اسلامؐ حق لے کر اٹھے۔ اور پھر تمام مخالفینِ حق ان کے سامنے سے بھاگتے ہوئے نظر آئیں گے: جَاءَ الْحَقُّ وَزَهَقَ الْبَاطِلُ إِنَّ الْبَاطِلَ كَانَ زَهُوقًا (حق آیا اور باطل مٹ گیا، اور باطل تھا ہی مٹنے والا)

تاریخ کا اشارہ

انتقام کا خاتمہ پشیمانی کا آغاز ہے۔ انتقام جب اپنی آخری حد پر پہنچتا ہے تو وہ پشیمانی اور اعتراف بن جاتا ہے ـــــــ یہ قدرت کا اٹل قانون ہے، اور تاریخ میں اس کی مثالیں کثرت سے موجود ہیں۔

انفرادی سطح پر اس کی ایک مثال حضرت عمر بن الخطابؓ کا واقعہ ہے۔ ابتداءً وہ اسلام کے منکر اور دشمن تھے۔ ان کو معلوم ہوا کہ ان کی بہن اور بہنوئی نے اسلام قبول کر لیا ہے۔ وہ ان کے گھر گئے۔ ان کے قبول اسلام پر ان کو اتنا غصہ تھا کہ وہ ان کو بری طرح مارنے لگے۔ یہاں تک کہ چوٹ کی وجہ سے ان کے جسم پر خون بہہ پڑا۔ عمر بن الخطاب نے جب اپنی بہن کے جسم پر خون دیکھا تو ان کا غصہ ٹھنڈا ہو کر شرمندگی میں تبدیل ہو گیا۔ انھوں نے بہن سے قرآن مانگا۔ پشیمانی کی نفسیات میں جب انھوں نے قرآن کو پڑھا تو وہ ان کے دل میں اتر گیا۔ انھوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہو کر اسلام قبول کر لیا۔

اجتماعی سطح پر اس معاملہ کی ایک مثال تاتاریوں کا واقعہ ہے۔ عباسی دور کے آخر میں تاتاری قبائل موجودہ روس کے پہاڑی علاقوں سے نکلے۔ بعض اسباب کے تحت ان کے اندر مسلمانوں کے خلاف انتقامی جذبہ جاگ اٹھا تھا۔ انھوں نے سمرقند سے لے کر بغداد تک بے شمار مسلمانوں کو قتل کیا۔ مسجدوں کو ڈھایا اور مسلم بستیوں کو ویران کر دیا۔ تاتاریوں نے جب یہ سب کچھ کر لیا تو ان کا غصہ ٹھنڈا ہو گیا۔ اب ان کے اندر ندامت اور اعتراف کا جذبہ جاگ اٹھا۔ مسلم آبادیوں کے کھنڈر کو دیکھ کر ان کے دل کے اندر ایمان کی دنیا تعمیر ہونے لگی۔ مسلمانوں کے عقائد اور ان کی زندگی کے آداب نے ان کو اپنی طرف کھینچنا شروع کیا۔ یہاں تک کہ دھیرے دھیرے بیشتر تاتاریوں نے اسلام قبول کر لیا۔

ہندستان میں بھی شاید یہی تاریخ دہرائی جانے والی ہے۔ مسلمانوں کے خلاف یہاں جس شدت کے ساتھ انتقامی جذبہ بھڑک اٹھا ہے، وہ ابدی طور پر جاری رہنے والا نہیں۔ وہ لازماً اپنی حد پر پہنچے گا۔ اور جب وہ حد پر پہنچے گا تو عین قدرت کے قانون کے تحت پشیمانی اور اعتراف کا دور شروع ہو جائے گا۔ اس کے بعد دوبارہ لوگ دیکھیں گے کہ جو لوگ اسلام کے دشمن تھے، وہ اسلام کے دوست بن گئے ہیں۔ انتقام کی شدت بتا رہی ہے کہ وہ دن اب شاید زیادہ دور نہیں۔

اسلام کا انکار خود اپنا انکار ہے، اور کون ہے جو خود اپنے انکار کا تحمل کر سکے۔

فطرت کی آواز

محمد اسرائیل صاحب بی ایس سی (۲۴ سال) الور کے رہنے والے ہیں۔ ان سے ۴ جنوری ۱۹۹۲ کو دہلی میں ملاقات ہوئی۔ وہ الرسالہ کے قاری ہیں اور دوسروں کو بھی الرسالہ پڑھاتے رہتے ہیں۔ انھوں نے کئی سبق آموز واقعات بتائے۔

انھوں نے کہا کہ الور کے گورنمنٹ کالج میں ۱۹۹۰ میں وہ اور مسٹر مدن لال قریب قریب رہتے تھے۔ مسٹر مدن لال وہاں ایم اے ہسٹری کے طالب علم تھے۔ اسرائیل صاحب نے ان کو الرسالہ انگریزی کا ایک شمارہ پڑھنے کے لیے دیا۔ چند دن کے بعد انھوں نے کہا کہ میں نے اس میگزین کو پڑھ لیا۔ تاثر پوچھنے پر انھوں نے کہا: اس کو پڑھتے ہوئے ایسا لگتا ہے کہ یہ کوئی رائٹر نہیں بول رہا ہے بلکہ انسان کا نیچر بول رہا ہے۔

یہ بلاشبہہ صحیح ترین تبصرہ ہے۔ الرسالہ میں اسلام کا پیغام ہوتا ہے۔ اور اسلام کی بات جب بے آمیز صورت میں پیش کر دی جائے تو وہ عین انسانی نیچر کی بات بن جاتی ہے۔ کیوں کہ اسلام دین فطرت ہے۔ اسلام فطرت انسانی کا مثنی ہے۔ اسلام انسان کا خود اپنا مطلوب ہے۔

قدیم زمانہ میں مذہبی تعصب بہت زیادہ پھیلا ہوا تھا۔ یہی مذہبی تعصب پیغمبروں کی بات کو سمجھنے اور ماننے میں رکاوٹ بنتا تھا۔ موجودہ زمانہ میں جدید افکار اور جدید تعلیم نے مذہبی تعصب کو ختم کر دیا ہے۔ اب انسانی فطرت سے وہ مصنوعی پردہ ہٹ گیا ہے جو قدیم زمانہ میں ہوا کرتا تھا۔ اس لیے اسلام اب انسان کے لیے عملاً اتنا ہی قابل قبول بن چکا ہے جتنا پانی کسی پیاسے آدمی کے لیے۔

اب اہل اسلام کو صرف یہ کرنا ہے کہ وہ ایسی ہر کارروائی سے بچیں جو ان کے اور غیر مسلموں کے درمیان نفرت کی فضا پیدا کرنے والی ہو۔ اور پھر اسلام کو اس کی سادہ صورت میں لوگوں کے سامنے پیش کر دیں۔ اس کے بعد غیر مسلم قومیں اسلام کو خود اپنے دل کی آواز سمجھ کر اس کی طرف دوڑ پڑیں گی۔

اسلام کی نفی کرنا خود اپنی نفی کرنا ہے۔ اور کون ہے جو خود اپنی نفی کرنے کی قیمت پر کسی چیز کا انکار کرے۔

ایک امکان

اخرج ابونعیم عن محمود بن لبید اخی بنی عبد الاشہل قال: لما قدم ابو الحیسم انس بن رافع مکۃ ومعہ فتیۃ من بنی عبد الاشہل فیہم ایاس بن معاذ رضی اللہ عنہ یلتمسون الحلف من قریش علی قومہم من الخزرج. فسمع رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بہم فاتاہم فجلس الیہم فقال: ھل لکم الی خیر مما جئتم لہ فقالوا وما ذاک قال انا رسول اللہ بعثنی اللہ الی العباد ادعوہم الی اللہ ان یعبدوا اللہ ولایشرکوا بہ شیئا وانزل علی الکتاب ثم ذکر الاسلام وتلا علیہم القرآن فقال ایاس بن معاذ وکان غلاما حدثا ای قوم، ھذا واللہ خیر مما جئتم لہ

مدینہ کے مشرک سردار ابو الحیسم مدینہ سے مکہ آئے۔ ان کے ساتھ بنو عبد الاشہل کے کچھ جوان تھے۔ ان میں ایاس بن معاذ بھی شامل تھے (جو بعد کو مسلمان ہو گیے) وہ لوگ قبیلہ خزرج کے مقابلہ میں قریش کو اپنا حلیف بنانا چاہتے تھے۔ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے ان کی آمد کی خبر سنی تو آپ ان کے یہاں گیے۔ آپ ان کے پاس بیٹھے اور فرمایا: تم لوگ جس مقصد کے لیے آئے ہو، کیا اس سے بہتر چیز کی تمہیں رغبت ہے۔ انھوں نے کہا کہ وہ کیا چیز ہے۔ آپ نے فرمایا کہ میں اللہ کا رسول ہوں۔ اس نے مجھے بندوں کی طرف بھیجا ہے۔ میں ان کو اللہ کی طرف بلاتا ہوں کہ وہ اللہ کی عبادت کریں اور اس کے ساتھ کسی چیز کو شریک نہ کریں۔ اور خدا نے میرے اوپر کتاب اتاری ہے۔ پھر آپ نے اسلام کا تذکرہ کیا اور ان کو قرآن پڑھ کر سنایا۔ یہ سن کر ایاس بن معاذ نے کہا، وہ اس وقت ایک نوجوان تھے، کہ اے قوم، یہ خدا کی قسم اس سے بہتر ہے جس کے لیے تم یہاں آئے ہو۔

مکہ قدیم زمانہ میں عرب کا مرکز تھا۔ مختلف بیرونی مقامات سے لوگ مکہ آتے رہتے تھے۔ کوئی سیاسی مقصد سے آتا، کوئی تجارتی مقصد سے، کوئی مذہبی مقصد سے۔ سیرت کی کتابوں سے معلوم ہوتا ہے کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کو جب ایسی کسی جماعت یا کسی شخص کی آمد کی اطلاع ملتی تو آپ چل کر اس کے

پاس جاتے اور اس کے سامنے اسلام پیش کرتے۔ پھر کوئی مانتا اور کوئی انکار کر دیتا۔ دیگر اصحاب بھی اسی اسوہ پر عمل کرتے۔

موجودہ زمانہ میں مجموعی اعتبار سے عرب ملکوں کی یہی صورت ہو رہی ہے۔ یہاں دنیا بھر سے لاکھوں کی تعداد میں لوگ آرہے ہیں۔ ان میں بہت بڑی تعداد غیر مسلموں کی ہوتی ہے۔ یہ لوگ معاش کے حصول کے لیے یا دوسرے مقاصد کے لیے عرب ملکوں میں آتے ہیں۔ اس طرح دوبارہ زیادہ بڑے پیمانہ پر وہی موقع پیدا ہو گیا ہے جو قدیم زمانہ میں رسول اور اصحاب رسول کو حاصل تھا۔

آج ضرورت ہے کہ عرب ممالک میں نہایت خاموشی اور نہایت منظم انداز میں اسی طرح لوگوں کے سامنے دین حق کی دعوت پیش کی جائے جس طرح دور اول میں پیش کی گئی تھی۔ انھیں بتایا جائے کہ تم لوگ یہاں پٹرو ڈالر کے لیے آئے ہو، مگر ہمارے پاس تمہارے لیے اس سے بھی زیادہ بڑی چیز ہے۔ وہ اللہ کا سچا دین ہے جو آدمی کے لیے جنت میں داخلہ کی ضمانت ہے۔ پٹرو ڈالر تمہارے معیار زندگی کو کچھ بڑھا سکتا ہے۔ مگر خدا کا سچا دین اختیار کر کے تم اپنی ابدی زندگی کو لامحدود طور پر کامیاب کر سکتے ہو۔

اگر ایسا کیا جائے تو یقین ہے کہ ان میں "ایاس بن معاذ" کی طرح ایسے لوگ نکلیں گے جو کہہ پڑیں کہ ـــــــ اى قوم، هذا والله خير مما جئتم له (اے لوگو، یہ اس سے بہتر ہے جس کے ارادہ سے تم یہاں آئے ہو) اس طرح یہ ہوگا کہ عرب دنیا جو آج لوگوں کے لیے صرف پٹرو ڈالر حاصل کرنے کا ذریعہ بنی ہوئی ہے وہ اس سے زیادہ بڑی دولت، دین حق کی دولت حاصل کرنے کا ذریعہ بن جائے گی۔

اطلاعات بتاتی ہیں کہ اس وقت بھی عرب دنیا میں لوگ اسلام قبول کر رہے ہیں۔ بیرونی ملکوں کے جو لوگ عرب ممالک میں تلاش روزگار کے لیے جاتے ہیں وہ اپنی معاشی ضرورت کے تحت عربی زبان سیکھتے ہیں۔ وہ اسلامی تہذیب کا مطالعہ کرتے ہیں۔ وہ عربوں سے میل ملاپ کے دوران اسلام کے بارہ میں معلومات حاصل کرتے ہیں۔ اس طرح ان کی ایک تعداد اسلام سے متاثر ہو کر اسلام قبول کر لیتی ہے۔

یہ وہ لوگ ہیں جو اپنے آپ کسی دعوتی جدوجہد کے بغیر اسلام قبول کر رہے ہیں۔ اب اگر باقاعدہ طور پر دعوت وتبلیغ کی جدوجہد شروع کی جائے اور اس کو حکیمانہ انداز میں چلایا جائے تو یہ رفتار یقینی طور پر بہت زیادہ بڑھ جائے گی۔

علم کی کسوٹی پر

بائبل میں آدم کے بعد انسانی نسل کا پورا شجرۂ نسب دیا گیا ہے۔ اس سے حساب لگا کر مسیحی علماء نے زمین پر آبادکاری کی مدت متعین کی ہے۔ یہ مدت ۱۹۷۵ میں ۵،۷۳۶ سال تھی۔ دوسری طرف جدید علمی طریقوں سے زمین کی عمر اور اس پر آبادکاری کی مدت کا جو اندازہ کیا گیا ہے، اس کے مطابق یہ مدت مذکورہ اندازہ سے بہت زیادہ قرار پاتی ہے۔ اس اختلاف نے جدید علماء کی نظر میں بائبل کے بیان کو مضحکہ خیز بنا دیا۔

اسی طرح بائبل میں ہے کہ اللہ تعالیٰ نے زمین و آسمان کو چھ دنوں میں پیدا کیا۔ یعنی ۲۴ گھنٹہ والے چھ دنوں میں۔ یہاں بھی سائنس کی تحقیق بائبل کے بیان سے ٹکرا رہی تھی۔ کیوں کہ سائنسی مطالعہ کائنات کی تخلیق کو اربوں اور رکھبوں سال کے درمیان پیش آنے والا ایک واقعہ بتا رہا تھا نہ کہ صرف ۱۴۴ گھنٹہ (چھ دن) کے اندر پیش آنے والا واقعہ۔ اس تضاد کی بنا پر جدید انسان کو بائبل علمی حیثیت سے ایک غیر معتبر کتاب نظر آنے لگی۔

علم اور مسیحیت کے درمیان اس طرح کے بہت سے ٹکراؤ پیش آئے۔ اس نے ابتداءً مسیحیت کو اور اس کے بعد تمام مذاہب کو جدید انسان کی نظر میں غیر حقیقی ثابت کر دیا۔ اس نے مذہب کو توہماتی قیاسات کا مجموعہ سمجھ کر اسے نظرانداز کر دیا۔

اس ٹکراؤ نے ابتداءً تمام مذاہب کو جدید انسان کی نظر میں غیر معتبر بنا دیا۔ مگر موجودہ صدی کے نصف ثانی میں مزید تحقیق نے بتایا کہ یہ ٹکراؤ دراصل سائنس اور محرف مذہب کے درمیان تھا نہ کہ سائنس اور حقیقی مذہب کے درمیان۔

اس جدید تحقیق نے ساری دنیا میں اسلام کی اشاعت کے نئے مواقع کھول دیے ہیں۔ ایک طرف دوسرے مذاہب ہیں جن کے متعلق واضح طور پر یہ ثابت ہو گیا ہے کہ وہ علمی لحاظ سے قابل اعتبار نہیں ہیں۔ دوسری طرف اسلام کے بارہ میں یہ ثابت ہوا ہے کہ وہ استثنائی طور پر دوسرے مذاہب سے الگ ہے۔ اسلام کی تعلیمات میں کوئی بات بھی غیر علمی نہیں۔ وہ جس طرح سچا الہام ہے، اسی طرح وہ خالص علم کی جانچ میں بھی پورا اترتا ہے۔

حق کی تلاش میں

مسٹر نٹور سنگھ چین اور پاکستان میں ہندستان کے سفیر رہ چکے ہیں۔ ان کے چینی دوستوں میں سے ایک خاتون بھی ہیں جن کا نام ہین سوئن (Han Suyin) ہے۔ مسٹر نٹور سنگھ نے اس چینی خاتون کا ذکر اپنی ایک کتاب میں کیا ہے جو ۱۹۸۳ میں شائع ہوئی ہے :

K. Natwar Singh, *Curtain Raisers*
Vikas Bhawan, New Delhi, 1983

اس کتاب کے ایک باب میں مذکورہ خاتون ہین سوئن کے وہ خطوط ہیں جو انھوں نے انگریزی میں مسٹر نٹور سنگھ کے نام لکھے تھے۔ ایک خط جس پر ۱۴ جون ۱۹۸۰ کی تاریخ درج ہے، اس میں مسز ہین سوئن لکھتی ہیں کہ میری شدید خواہش ہے کہ آپ سے اسلام کے بارہ میں بہت لمبی گفتگو کروں :

I do intend to have a very long talk with you on Islam.

خط میں یا اصل کتاب میں اس کی مزید تفصیل درج نہیں۔ غالباً ہین سوئن کو کوئی مسلمان نہیں ملا جس سے بات کرکے وہ اسلام کے بارہ میں تفصیلی معلومات حاصل کریں۔ انھوں نے مسٹر نٹور سنگھ کو اس حیثیت سے دیکھا کہ وہ ہندستان کے باشندے ہیں، اور ہندستان وہ ملک ہے جہاں انڈونیشیا کے بعد دوسری سب سے بڑی مسلم آبادی ہے۔ نیز مسٹر نٹور سنگھ ایک مسلم ملک (پاکستان) میں سفیر رہ چکے ہیں۔ اس بنا پر مسز ہین سوئن نے سمجھا کہ وہ ان کو اسلام کے بارے میں تفصیلی معلومات دے سکیں گے۔

اللہ کے کتنے بندے اور بندیاں سچائی کی تلاش میں ہیں مگر کوئی ان کو سچائی کی بات بتانے والا نہیں۔ کوئی شخص نبوت کا دعوی کرے تو تمام مسلمان اس سے لڑنے کے لیے کھڑے ہو جائیں گے۔ مگر کارِ نبوت سے عملاً وہ اس طرح غافل ہیں جیسے انھیں انتظار ہو کہ دوبارہ کوئی نبی آئے اور ان کی طرف سے یہ کام کر دے۔ یہ صورتِ حال اس وقت ہے جب کہ مسلمان ساری دنیا میں تقریباً ایک سو کروڑ ہیں۔ ہجوم کے درمیان سناٹا کی اس سے زیادہ عجیب مثال کوئی دوسری نہیں ملے گی۔

ایک لطیفہ

شیخ سعدی شیرازی (۱۲۹۲ - ۱۱۹۳) فارسی کے مشہور شاعر ہیں۔ ان کی کتابوں (گلستاں، بوستاں) کے ترجمے یورپ کی اکثر زبانوں میں ہوئے ہیں۔ ایک مستشرق ڈاکٹر ہرڈر (J.G. Herder) نے سعدی کی کتاب گلستاں کے بارہ میں لکھا ہے کہ وہ سلطان کے باغ میں اگنے والا بہترین پھول ہے:

... the finest flower that could blossom in
a Sultan's garden. (9/964)

شیخ سعدی کا ایک لطیفہ ہے۔ ایک بار وہ کاشغر میں تھے جو اس وقت چینی ترکستان کا صدر مقام تھا۔ یہ زمانہ وہ تھا جب کہ تاتاریوں اور خوارزمیوں میں جنگ کے بعد عارضی صلح ہو گئی تھی۔ شیخ سعدی نے ایک مسجد میں دیکھا کہ ایک طالب علم عربی قواعد کی کتاب ہاتھ میں لیے ہوئے ہے اور ضَرَبَ زَیْدٌ عَمْرواً، ضَرَبَ زَیْدٌ عَمْرواً کا جملہ رٹ رہا ہے۔ انھوں نے طالب علم سے کہا کہ صاحبزادے، خوارزم اور خطا میں تو صلح ہو گئی، مگر زید و عمرو کی لڑائی ابھی چلی جا رہی ہے۔ طالب علم ہنس پڑا اور شیخ کا وطن پوچھا۔ شیخ کی زبان سے شیراز کا نام سنا تو فرمائش کی کہ سعدی کا کچھ کلام یاد ہو تو سناؤ۔ شیخ سعدی نے حسب موقع یہ شعر موزوں کر کے پڑھا:

اے دل عشاق بدام تو صید   ما بتو مشغول و تو با عمرو و زید

اے وہ کہ عاشقوں کے دل تیرے دام میں گرفتار ہیں، ہم تجھ میں مشغول ہیں اور تو عمرو اور زید میں مشغول ہے۔

یہ لطیفہ موجودہ زمانہ کے مسلمانوں پر پوری طرح صادق آتا ہے۔ موجودہ زمانہ میں جنگ کا طریقہ فرسودہ ثابت ہو چکا ہے۔ تمام ترقی یافتہ قومیں اپنے نزاعات کو گفت و شنید کے ذریعہ طے کر رہی ہیں۔ حتی کہ روس اور امریکہ نے ایک دوسرے کے خلاف اپنے ہتھیاروں کو رکھ دیا ہے۔ مگر مسلمان ہر جگہ جہاد کے نام پر بے فائدہ لڑائی میں مشغول ہیں۔

موجودہ زمانہ کا انسان تمام چیزوں سے اکتا کر دین حق کی طرف آرہا ہے۔ وہ اسلام کے سایۂ رحمت میں پناہ لینا چاہتا ہے۔ مگر مسلمان لڑائی جھگڑے کے کاموں میں اتنا زیادہ مشغول ہیں کہ ان کو نہ جدید انسان کی اس طلب کی خبر ہے اور نہ اس کو استعمال کرنے کی فرصت۔

نظریاتی خلا

۱۹۹۱ کے خاتمہ کے ساتھ سوویت یونین کا بھی خاتمہ ہوگیا۔ اس سیاسی خاتمہ کے ساتھ اشتراکیت (کمیونزم) کا فکری سحر بھی ختم ہوگیا۔ فکری سحر کے خاتمہ کی مختلف علامتوں میں سے ایک عبرت انگیز علامت یہ ہے کہ ولادیمیر لینن کے دیوقامت مجسمے جو اس سے پہلے اشتراکی شہریوں کو اپنے چھوٹے ہونے کا احساس دلاتے تھے، اب وہ انھیں اشتراکی شہریوں کے ہاتھوں ذلت کے ساتھ گرائے جا رہے ہیں۔

۱۹۹۱ کے خاتمہ کے مہینوں میں ہر جگہ اسی کا چرچا تھا۔ اس زمانہ میں ہر اخبار اور ہر میگزین میں ایسے مضامین آرہے تھے جن کا عنوان ہوتا تھا ــــــ سوویت یونین کا انہدام (The collapse of Soviet Union)

اس کے بعد ہر طرف یہ کہا جانے لگا کہ اب دو قطبی دنیا (bi-polar world) کا دور ختم ہوگیا اور اب ایک قطبی دنیا (uni-polar world) کا دور شروع ہو چکا ہے۔ یہ باتیں ہو رہی تھیں کہ ۹ جنوری ۱۹۹۲ کے اخبارات یہ خبر لائے کہ صدر امریکہ مسٹر جارج بش ٹوکیو میں ایک اسٹیٹ ڈنر پر تھے کہ وہ اپنی کرسی سے گر پڑے۔ ٹائمس آف انڈیا (۹ جنوری ۱۹۹۲) کی سرخی کے الفاظ یہ تھے :

Bush collapses at Tokyo reception.

روس میں کمیونزم کا خاتمہ : لینن کا مجسمہ زمین پر گرا ہوا ہے

راقم الحروف کا خیال ہے کہ پہلا انہدام اگر حقیقی تھا تو دوسرا انہدام علامتی ہے۔ سوویت یونین عملاً منہدم ہو چکا۔ امریکہ بھی امکانی طور پر اپنے انہدام کے قریب ہے۔ جارج بش کا گرنا امریکہ کے گرنے کی علامتی پیشین گوئی ہے۔

ایک مبصر نے بجا طور پر لکھا ہے کہ تقریباً ۳۰ سال پہلے سابق روسی وزیر اعظم خروشچیف نے اقوام متحدہ میں تقریر کرتے ہوئے اعلان کیا تھا کہ کمیونسٹ سرمایہ داری نظام کو دفن کر دیں گے:

Communists would bury capitalism..

مگر کمیونسٹ نظام خود اپنے داخلی تضادات (inner contradictions) کا شکار ہو کر منہدم ہو گیا۔ اب دوسرے سپر پاور امریکہ کے لیے متحدہ یورپ اور جاپان زبردست اقتصادی خطرہ بن کر ابھرے ہیں۔ بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جو انجام سرخ سپر پاور کا ہو چکا ہے وہی انجام سفید سپر پاور کا آئندہ ہونے والا ہے۔

انسان بنیادی طور پر ایک توجیہہ پسند مخلوق ہے۔ وہ لازمی طور پر ایک آئیڈیالوجی (نظریہ) چاہتا ہے جس کے ذریعہ وہ کائنات کی توجیہہ کرے۔ جس کے ذریعہ وہ یہ متعین کر سکے کہ وہ کیا ہے اور تاریخ میں اس کا مقام کیا ہے۔ اس قسم کی ایک آئیڈیالوجی کے بغیر آدمی زندہ نہیں رہ سکتا۔

امریکہ کے پاس انسان کو دینے کے لیے اس قسم کی کوئی آئیڈیالوجی نہیں۔ اس کا واحد ایڈوانٹج یہ ہے کہ اس کے پاس ایک قابل عمل معاشی ڈھانچہ (workable system) ہے۔ سوویت یونین کا معاشی ڈھانچہ اس کے مقابلہ میں ناقابل عمل (unworkable) تھا۔ اور یہی اصلاً اس کے انہدام کا سبب بنا۔

تاہم سوویت یونین کے پاس ایک آئیڈیالوجی تھی۔ یہ اگرچہ ایک جھوٹی آئیڈیالوجی (false ideology) تھی۔ مگر اس کے ذریعہ انسان کو ایک فرضی تسکین حاصل تھی کہ وہ اس پوزیشن میں ہے کہ زندگی اور کائنات کی توجیہہ کر سکے۔ سوویت یونین کے انہدام سے یہ بھرم ختم ہو گیا۔

ٹائمس آف انڈیا (۱۲ جنوری ۱۹۹۲) میں ایک تجزیہ چھپا ہے۔ اس کا عنوان ہے ــــ سوویت یونین کے انہدام کے بعد:

The aftermath of the Soviet colapse

تجزیہ نگار نے بجا طور پر لکھا ہے کہ سوویت یونین کا انہدام سادہ طور پر صرف ایک ایمپائر کا انہدام نہیں۔ یہ در حقیقت جدید انسان کے سوچنے کے ڈھانچہ (structure of thinking) میں بنیادی تبدیلی پیدا کرنے والا ہے۔ یہ تاریخ کے عمل (course of history) کے بارہ میں ہمارے نقطۂ نظر (outlook) کو بدل دینے والا واقعہ ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ اشتراکی ایمپائر کے انہدام کے بعد عالمی سطح پر ایک نظریاتی خلا (ideological vacuum) پیدا ہو گیا ہے۔ اب دنیا کے سامنے عملاً کوئی نظریہ حیات سرے سے موجود ہی نہیں۔

سوویت یونین کا عملی انہدام اور امریکہ کا امکانی انہدام اب اس درجہ کو پہنچ رہا ہے جس کو ایک مغربی عالم نے جدید تہذیب کا انہدام (collapse of civilization) سے تعبیر کیا ہے۔ انسانی دنیا میں عالم گیر نظریاتی خلا کا دور آچکا ہے یا کم از کم، وہ بہت جلد آنے والا ہے۔

اس صورت حال کے پیش نظر، ٹائمس آف انڈیا کے مذکورہ تجزیہ نگار نے اپنا مضمون ان الفاظ پر ختم کیا ہے کہ اشتراکیت کو گرہن لگنے کے بعد لازمی ہے کہ کوئی متبادل نظریہ اٹھے جو ان مسائل کا حل بتائے جو آج انسانیت کو گھیرے ہوئے ہیں :

> **The ideological vacuum left by the eclipse of socialism is bound to lead to alternative ideological formulations which would assume new relevance in the context of the pressing problems and challenges faced by humanity today.**

یہاں خود حالات میں وہ اشارہ موجود ہے جو بتاتا ہے کہ وہ متبادل نظریہ کون سا ہو سکتا ہے جو انسانیت کو اس کی مطلوب چیز دے سکے۔ سوویت یونین میں بسنے والے انسان کو بیک وقت دو تلخ تجربے ہوئے۔ ایک، کمیونسٹ ڈکٹیٹر شپ کی طرف سے پیش آنے والا تشدد۔ دوسرا، مذہب کو اختیار کرنے کے جرم میں مسلسل تعذیب۔ سوویت انسان نے تشدد کی بنا پر کمیونزم کو چھوڑ دیا۔ مگر اسی تشدد کے باوجود وہ مذہب کو چھوڑنے پر راضی نہ ہوا۔

مذہب انسان کی فطری طلب ہے، اور جو چیز فطری طلب ہو اس کو چھوڑنا انسان کے لیے ممکن نہیں۔

وسط ایشیا

سمرقند وسط ایشیا (سنٹرل ایشیا) کا ایک قدیم مسلم شہر ہے۔ ۱۹۲۸ میں کمیونسٹ فوجوں نے یہاں کے مسلم نواب کو شکست دے کر اس پر قبضہ کرلیا۔ اس کے بعد ایک روسی لیڈر نے کتاب لکھی۔ اس کا انگریزی ترجمہ اسی زمانہ میں "سمرقند کے اوپر صبح" کے نام سے شائع ہو چکا ہے :

Dawn over Samarkand

اس کتاب میں کمیونسٹ مصنف نے فخر کے ساتھ لکھا تھا کہ —— سمرقند کا ملّا چیختا رہا۔ مگر ہماری توپوں کے گولے اس کی چیخ پر بھاری ثابت ہوئے اور ہم نے اس مسلم شہر پر قبضہ کرلیا۔ اس واقعہ کے ساٹھ سال بعد اشتراکی ایمپائر کی حربی طاقت بہت زیادہ بڑھ گئی۔ اب اس کے پاس روایتی توپوں کے بجائے ۲۰ ہزار کی تعداد میں ایٹم بم موجود تھے۔ مگر وہ اتنا بے بس ہوا کہ اپنے بموں کو استعمال کرنے کی طاقت بھی اس کے اندر نہ رہی۔ ایٹم بموں اور دوسرے جدید ہتھیاروں کی کثرت کے باوجود اس کا پورا ڈھانچہ تاش کے پتوں کی طرح ڈھ پڑا۔
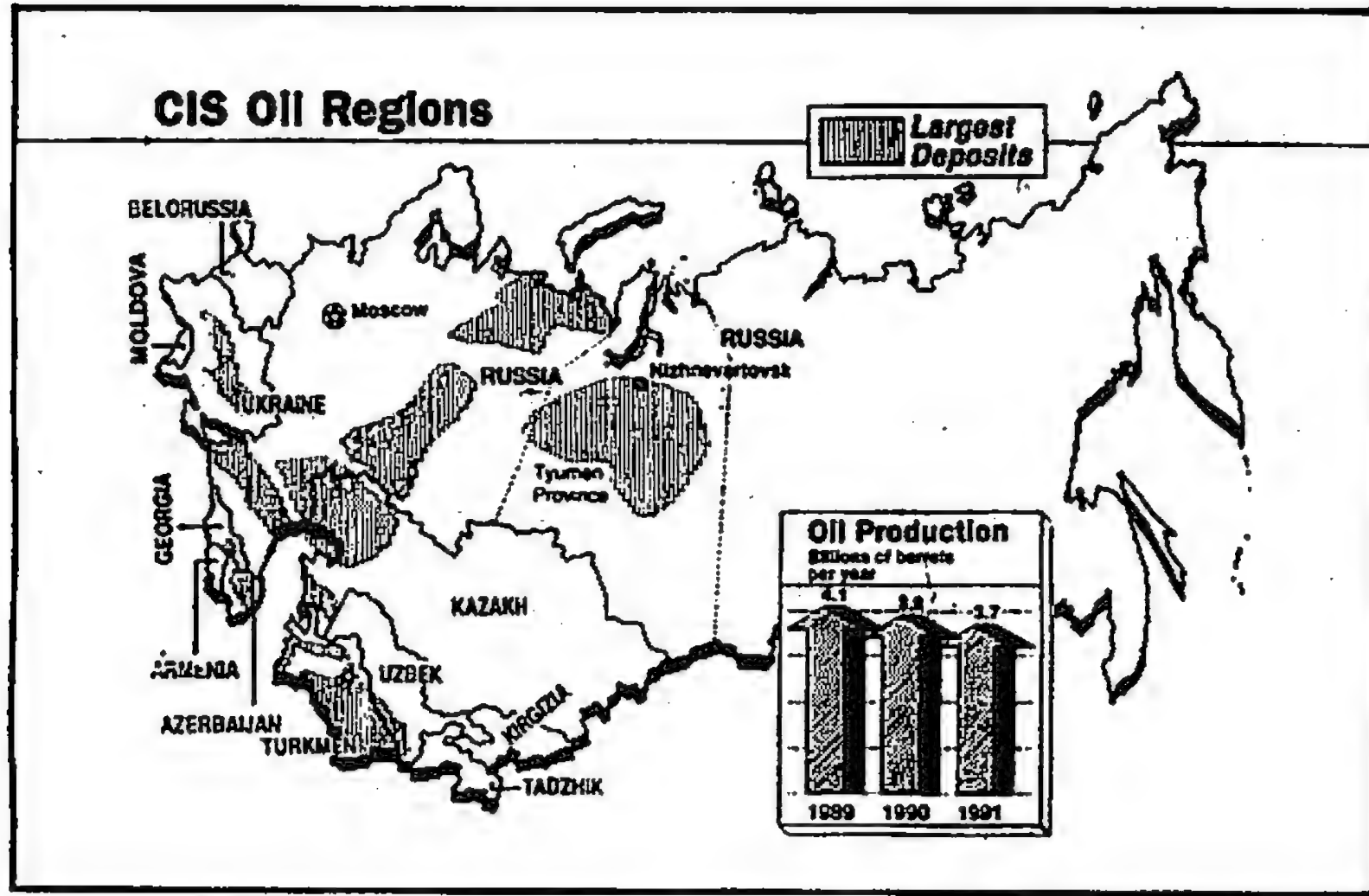
اشتراکی صبح نہ صرف سمرقند کے لیے بلکہ پورے سوویت یونین کے لیے صرف اندھیرا ثابت ہوئی۔

۱۹۹۱ میں سوویت یونین اپنی بدترین کمزوریوں کا شکار ہو کر ٹوٹا تو اسی کے ساتھ نہ صرف سمرقند بلکہ وسط ایشیا کی نصف درجن مسلم ریاستیں (آذربائیجان، قازقستان، کرغیزیہ، تاجکستان، ترکمانستان، ازبکستان) بھی اچانک آزاد ہو گئیں۔ ۱۹۹۱ سے پہلے جہاں سرخ پرچم لہرا رہا تھا وہاں اب ایک وسیع علاقہ میں ایک طاقت ور مسلم بلاک وجود میں آگیا ہے۔

سوویت یونین کے غلبہ کے زمانہ میں حکومت نے ہر طرح اس علاقہ میں روسی زبان کو رائج کرنے کی کوشش کی تھی۔ سرکاری طور پر روسی زبان کو ثقافتی برتری (Cultural supremacy) دینے کی تمام تدبیریں کی گئیں۔ مگر یہ تدبیریں ناکام رہیں۔ مجھے اپنے سفر روس (جولائی ۱۹۹۰) میں یہ دیکھ کر حیرت ہوئی کہ یہاں کے مسلمان روسی کے ساتھ ترکی اور فارسی زبانیں بھی جانتے ہیں اور آپس میں ان زبانوں کو بولنے کی کوشش کرتے ہیں۔

کمیونسٹ قبضہ کے بعد روسی تہذیب کو پورے علاقہ میں غالب کرنے کی کوشش کی گئی۔ اس کوشش کو عام طور پر سلاو نائزیشن (Slavonisation) کہا جاتا ہے۔ اس منصوبہ کے تحت مسلمانوں کے اسلامی نام بدلے گئے۔ مثلاً نیاز کو نیازوف، نظر کو نظربائیوف، سلطان کو سلطانوف وغیرہ۔ سنٹرل ایشیا کے ماہر ڈاکٹر ڈینیل پائپس (Daniel Pipes) نے لکھا ہے کہ روسی سیاست اور روسی کلچر کی اس توسیع کی بنا پر مغربی علماء وسط ایشیا کو یورپ کی آخری بڑی کالونی (Last great colony) کہنے لگے تھے۔

لندن اور قاہرہ کے درمیان جو فاصلہ ہے وہی فاصلہ ماسکو اور تاشقند کے درمیان ہے۔ تاہم روسی حکمراں ۱۵۵۲ سے ہی اس علاقہ میں سیاسی مداخلت کرنے لگے تھے۔ ۱۹۱۷ میں اشتراکی انقلاب کے بعد یہ تدخل زیادہ بڑھا۔ یہاں تک کہ ۱۹۲۸ کے بعد یہاں حدیدی نظم (Iron discipline) قائم کر دیا گیا۔

اعداد و شمار کے مطابق، ۱۹۳۹ میں پورے سوویت یونین میں مسلم آبادی کا تناسب ۸ فی صد سے کچھ زیادہ (8.7 Per cent) تھا۔ اس تعداد میں تیزی سے اضافہ ہوتا رہا۔ ۱۹۹۰ میں مسلمانوں کی تعداد ۱۹ فی صد سے زیادہ (19.9 Per cent) ہو گئی۔ اس مدت میں غیر مسلم آبادی میں اضافہ کی

شرح تقریباً ۵ فی صد تھی۔ جب کہ مسلم آبادی میں اضافہ کی شرح ۲۷ فی صد تک پہنچ گئی۔ سوویت یونین اگر باقی رہتا تو عنقریب سوویت فوج میں ہر تین فوجی میں سے ایک مسلمان ہوتا۔ بہت کم لوگ جانتے ہیں کہ کرغیزیہ کی راجدھانی اوش (Osh) کو دوسرا مکہ کہا جاتا ہے۔ آذربائیجان میں شیعوں کی اکثریت ہے۔ مگر مجموعی طور پر اس علاقہ کے مسلمان زیادہ تر سنی ہیں۔

وسط ایشیا کی ان آزاد مسلم ریاستوں کی واحد کمی یہ ہے کہ وہ سمندری ساحل سے محروم (Land locked) ہیں۔ یہ کمی پڑوسی مسلم ملکوں (ترکی، ایران، پاکستان) کے ذریعہ پوری ہو سکتی ہے۔ چنانچہ ترکی سب سے پہلا ملک تھا جس نے الما آتا (Alma Ata) کے فیصلہ کے بعد ان ریاستوں کو آزاد ریاست کی حیثیت سے تسلیم کیا۔ ایران نے اپنی سرحد تک ریلوے لائن بچھانے میں مدد دینے کی پیش کش کی ہے۔ پاکستان نے فیاضی کا مظاہرہ کرتے ہوئے افغانستان کے راستہ سے پاکستان کی بندرگاہوں تک خشک راستہ (Land route) دینا منظور کیا ہے۔ ان ریاستوں کے لیے ترکی کے راستہ سے میڈیٹرینین تک پہنچنا بہت آسان ہے۔

ایک مبصر کے الفاظ میں، یہ علاقہ امکانات سے بھرا ہوا ہے :

The religion is full of possibilities.

ازبکستان کپاس کی پیداوار کے لیے مشہور ہے۔ قازقستان میں تیل کے ذخائر ہیں۔ تاجکستان زراعت کے لیے بہت موزوں ہے۔ ترکمانستان میں کپاس کی پیداوار کے وسیع امکانات ہیں۔ کرغیزیہ زراعت کے وسائل سے مالا مال ہے۔ آذربائیجان میں کثیر تعداد میں تیل کے ذخائر پائے جاتے ہیں۔

ایک مبصر نے کہا ہے کہ اشتراکیت کی موت کے بعد یہ امید کرنا بالکل فطری ہے کہ اس خطہ میں اسلامی نظریہ کو قائم کرنے کا رجحان ابھرے گا :

It would be natural to expect that with the death of communism there would be a trend towards establishment of Islamic ideology in the six republics.

حقیقت یہ ہے کہ سابق سوویت یونین کے زیر اقتدار ان مسلم ریاستوں کے آزاد ہونے کے بعد، جغرافی نقشہ پر ایک عظیم مسلم بلاک وجود میں آگیا ہے۔ اگر یہ پورا بلاک متحد ہو جائے تو قریبی مستقبل میں بلاشبہ اسلام دنیا کی سب سے بڑی طاقت بن جائے گا۔

دروازہ کھلتا ہے

روس میں ۱۹۱۷ میں کیمونسٹ انقلاب آیا۔ اس کے بعد پورے سوویت روس میں مذہب کو خلاف قانون قرار دے دیا گیا۔ مذہب کے نام پر تنظیم بنانا، اجتماع کرنا، کتاب چھاپنا، ہر چیز قانونی طور پر ممنوع قرار پائی۔ تاہم نصف صدی کی مجنونانہ مذہب دشمنی کے بعد وہاں کے حالات بدلنا شروع ہوئے۔ اندازہ ہے کہ امریکی صدر مسٹر رونالڈ ریگن کا دورۂ ماسکو (۲۹ مئی - ۲ جون ۱۹۸۸) اس اعتبار سے روس میں نئے دور کا آغاز ہوگا۔ ریگن روسی حکمرانوں سے جو بات منوانا چاہتے ہیں۔ ان میں مذہبی آزادی بھی خصوصیت کے ساتھ شامل ہے۔

اس دورہ کے موقع پر ماسکو میں ۶۳ ملکوں کے تقریباً ساڑھے پانچ ہزار جرنلسٹ جمع ہوئے۔ ان کا کہنا ہے کہ ۱۹۷۴ میں جب نکسن۔ برزنیف ملاقات ماسکو میں ہوئی تھی تو صحافیوں پر سخت پابندیاں تھیں۔ مگر اس بار انھیں ہر قسم کی کھلی آزادی حاصل رہی۔ یہ روس میں ایک نئے انقلاب کی علامت ہے جس کا آغاز روس کے موجودہ حکمراں گورباچیف نے کیا ہے۔

اس سلسلہ میں ماسکو سے جو خوش آئند خبریں آئی ہیں، ان میں سے ایک یہ ہے کہ انٹرنیشنل پولس کے دفتر کے سامنے مختلف چیزوں کی فروخت کا انتظام کیا گیا ہے۔ ان میں سب سے زیادہ غیر معمولی چیز بائبل کا روسی ترجمہ ہے۔ یہ ترجمہ روس میں مسیحیت کی ہزار سالہ برسی کے موقع پر چھاپا گیا ہے اور اس کی قیمت ۶۵ ڈالر ہے:

The most unusual buy has to be the modern Russian version of the Bible on sale periodically in the lobby in front of the international press briefing room. Put out to commemorate this summer's 1000th anniversary of Christianity in the Soviet Union, it retails for $65.

یہ خبر ٹائمس آف انڈیا (۳۰ مئی ۱۹۸۸) میں صفحہ ۷ پر اور ہندستان ٹائمس (۳۰ مئی ۱۹۸۸) میں صفحہ ۱۶ پر شائع ہوئی ہے۔ یہ ایک بے حد اہم خبر ہے۔ وہ بظاہر مسیحیت کی ہزار سالہ برسی سے تعلق رکھتی ہے، اگر حقیقۃً وہ اشتراکی روس میں مذہب کے از سر نو احیاء کی علامت ہے۔ یہ خبر بتاتی ہے کہ عارضی وقفہ کے بعد روس میں دوبارہ مذہب کو آزادانہ عمل کے مواقع حاصل ہو گئے ہیں۔

السيد جمال الدين وجه كل عنايته للسياسة

الأستاذ الامام محمد عبده

قال السيد جمال الدين الأفغانى

ان أهل أوروبا مستعدون لقبول الاسلام ، اذا أحسنت الدعوة اليه فقد قارنوا بين الدين الاسلامى وبين غيره فوجدوا البون شاسعا من حيث يسر العقائد وقرب تناولها ، وأقرب من أهل أوروبا الى قبول الاسلام أهل أمريكا لأنه لا يوجد بينهم وبين الأمم الاسلامية عداوات موروثة ولا أضغان مدفونة مثلما هو الحال بين المسلمين والاوربيين .

والقرآن من أكبر الوسائل فى لفت نظر الافرنج الى حسن الاسلام ، فهو يدعوهم بلسان حاله اليه ، لكنهم يرون حالة المسلمين السوآى من خلال القرآن فيقعدون عن اتباعه والايمان به ، فاذا أردنا اليوم أن نحمل غيرنا على الدخول فى ديننا ، وجب علينا قبل كل شىء أن نقيم لهم البرهان — على أننا متمسكون بخصال الاسلام .. والا لم نكن مسلمين كاملين .

وأفاض السيد فى (بيان) مزايا القرآن وتعاليمه السامية : من ذلك أنه (أى القرآن)أول من دلنا على الوصول الى الحقائق بالطريقة الفلسفية وهى (لم) و (ولماذا) ، اذ أن معظم آيات القرآن واردة فى معرض : لم كان الأمر كذا ؟ ولماذا كان الأمر كذا ؟ وتكليف المخاطبين أن يعطوا الجواب المعقول على هذا السؤال ، وليست الفلسفة سوى ذلك .

قال : ومن مزايا القرآن « أن العرب قبل انزال القرآن عليهم كانوا فى حالة همجية لا توصف ، فلم يمض عليهم قرن ونصف من الزمان حتى ملكوا عالم زمانهم ، وفاقوا أمم الارض سياسة وعلما وفلسفة وصناعة وتجارة ، وكل هذا لعمرى لم ينتج الا عن هدى القرآن — فالقرآن وحده الذى كان كافيا فى اجتذاب الامم القوية وهدايتها جدير أن يكون كافيا اليوم أيضا فى اجتذاب الامم الحديثة وهدايتها .

السيد جمال الدين رجل عالم وأعرف الناس بالاسلام ، وحالة المسلمين ، وكان قادرا على النفع العظيم بالافادة والتعليم ؛ ولكنه وجه كل عنايته الى السياسة فضاع استعداده هذا وانى أعجب لجعل نبهاء المسلمين وجرائدهم — كل همهم فى السياسة ، واهمالهم أمر التربية الذى هو كل شىء ، وعليه يبنى كل شىء !

ان السيد جمال الدين كان صاحب اقتدار عجيب لو صرفه ووجهه للتعليم والتربية لأفاد الاسلام أكبر فائدة ، وقد عرضت عليه حين كنا فى باريس أن نترك السياسة ونذهب الى مكان بعيد عن مراقبة الحكومات ، ونعلم ونربى من نختار من التلاميذ على مشربنا ، فلا تمضى عشر سنين الا ويكون عندنا كذا وكذا من التلاميذ الذين يتبعوننا فى ترك أوطانهم والسير فى الأرض لنشر الاصلاح المطلوب فينتشر أحسن الانتشار ! فقال : انما أنت مثبط !

سید جمال الدین افغانی نے کہا : یورپ کے لوگوں کے سامنے اگر اسلام کی دعوت اچھی طرح پیش کی جائے تو وہ اسلام قبول کرنے کے لیے بالکل تیار ہیں۔ کیوں کہ انھوں نے اسلام اور دوسرے ادیان کا تقابلی مطالعہ کیا تو انھوں نے پایا کہ عقیدہ و عمل کی آسانی کے اعتبار سے دونوں میں بہت فرق ہے۔ اور مغربی اقوام میں قبول اسلام کے اعتبار سے سب سے زیادہ قریب امریکہ کے لوگ ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ان کے اور اسلامی قوموں کے درمیان اس طرح کی قدیم عداوتیں نہیں ہیں جو مسلمانوں اور یورپی قوموں کے درمیان ہیں۔

اہل مغرب کو اسلام کی طرف متوجہ کرنے کے لیے سب سے بڑا ذریعہ قرآن ہے۔ قرآن کی دعوت اصل اسلام کی طرف ہے۔ مگر وہ قرآن کے حاملین کی بگڑی ہوئی حالت کو دیکھتے ہیں اور اس کی وجہ سے اس سے دور ہو جاتے ہیں۔ اب اگر ہم چاہتے ہیں کہ دوسری قوموں کو اسلام کی طرف لے آئیں تو ہر چیز سے پہلے ضروری ہے کہ ان پر برہان قائم کریں، اس طرح کہ ہم اسلام کی صفات پر عامل ہوں۔ ورنہ ہم پورے مسلمان قرار نہیں پا سکتے۔

قرآنی تعلیمات کے فضائل کے بارے میں سید افغانی نے فرمایا : قرآن ہی وہ کتاب ہے جس نے سب سے پہلے فلسفیانہ طریق سے حقائق تک پہنچنے کا راستہ بتایا۔ قرآن کی بیشتر آیات میں اس طرح کے سوالات قائم کیے گئے ہیں : ایسا کیوں، ویسا کیوں۔ اور مخاطب سے مطالبہ کیا گیا ہے کہ وہ اس کا معقول جواب دے۔ اور فلسفہ اس کے سوا کسی اور چیز کا نام نہیں۔

انھوں نے کہا : قرآن کے اترنے سے پہلے عرب کے لوگ انتہائی پست حالت میں تھے۔ مگر ان پر ڈیڑھ سو سال بھی نہیں گزرے کہ انھوں نے اپنے وقت کی آباد دنیا کو فتح کر لیا۔ اور دنیا کی قوموں سے سیاست، علم، فلسفہ، صنعت، تجارت ہر چیز میں بڑھ گئے، اور بخدا یہ سب کچھ قرآن کا کرشمہ تھا۔ قرآن تنہا پچھلی قوموں کو کھینچنے اور ان کو ہدایت پر لانے کے لیے کافی تھا۔ وہی آج بھی جدید قوموں کو کھینچنے اور ہدایت دینے کے لیے بالکل کافی ہے۔

سید جمال الدین ایک بڑے عالم تھے اور اسلام اور مسلمانوں کی حقیقت کو خوب سمجھتے تھے۔ ان کی ذات سے لوگوں کو بہت بڑا فائدہ پہنچ سکتا تھا۔ مگر انھوں نے اپنی ساری توجہ سیاست کی طرف موڑ دی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ان کی صلاحیتیں ضائع ہو گئیں۔

مجھے حیرت ہے کہ موجودہ زمانہ میں تمام اعلیٰ صلاحیت کے مسلمانوں اور ان کے جرائد نے اپنی ساری توجہ سیاست کی طرف موڑ دی اور تربیت وتعلیم کے کام کو چھوڑ دیا جو کہ سب سے زیادہ اہم تھا اور جس پر تمام دوسری چیزوں کا انحصار تھا۔

سید جمال الدین عجیب وغریب کمالات کے حامل تھے۔ اگر انھوں نے اپنے آپ کو تعلیم وتربیت کے کام میں لگایا ہوتا تو وہ اسلام کو بہت بڑا فائدہ پہنچا سکتے تھے۔ میں نے یہ بات ان کے سامنے رکھی تھی جب کہ ہم پیرس میں تھے۔ یہ کہ "ہم سیاست کو چھوڑ دیں اور حکومت کی نظروں سے دور جا کر نوجوانوں کی تعلیم وتربیت کریں۔ اگر ہم ایسا کریں تو دس برس میں ہمارے پاس ایک ٹیم تیار ہو جائے گی اور وہ ساری دنیا میں اصلاح وتبلیغ کا کام نہایت کامیابی کے ساتھ انجام دے گی۔" انھوں نے جواب دیا: "تم تو حوصلہ پست کرنے والی باتیں کرتے ہو۔"

یہ اچنبھے کی بات ہے کہ پچھلے ۲۰ برسوں میں اسلام فرانس کا دوسرا سب سے زیادہ اہم مذہب بن گیا ہے۔ وہ صرف رومن مسیحیت کے بعد دوسرے نمبر پر ہے۔ پروٹسٹنٹ مسیحیت سے وہ بہت

Islam is France's second religion

It is surprising that in the past 20 years Islam has become the second most important religion in France after Roman Catholicism. It is far ahead of Protestantism and mosques served by permanent imams now stand in 17 provincial centres. Roman Catholic churches are often three-quarters empty. But Friday prayers in the Paris Mosque attract between 5,000 and 6,000 people who spill out into adjoining halls and courtyards to listen to the prayers over loudspeakers. For the feast of *Id-al-Fitr*, which marks the end of Ramadan, the congregation swells to nearly 11,000, and all round the mosque people kneel in the streets. It is estimated that there are 14 million practising Catholics in France as distinct from people baptized as Catholics, who are far more numerous. The Muslims come next with about two million, then protestants with 1,250,000; Jews, who number 900,000, and Buddhists, about 80,000. Before 1939 the Muslim population of France was so small that there were no official statistics of their number. But after the Second World War the Muslim population changed. Many families settled here, particularly from the former colonies in North Africa. Sometimes they had to live in appalling conditions. The wave of immigration increased sharply after 1954 and lasted until 1970. In addition to the families from North Africa, large numbers arrived in France from black Africa. Now the Muslim community consists of mainly working people, and about 250,000 of them live in the Paris region. In Marseilles there are about 750,000, and in Lyons about 300,000 Some are professors, others cannot read or write. The only thing they have in common is their faith in Islam. Speaking about this disparate community, Si Hamza Boubakeur, rector of the Muslim Institute of the Paris Mosque, said: "I realized that I could not afford to stress religious differences, but must give common spiritual nourishment to all, free from any sectarian spirit". He was also confronted with many material problems: housing, jobs, education, and integration into the French community. The women, on whom the family structure is based at first found themselves in a "linguistic prison", unable to communicate. On a wall of his study is a portrait of the Shah of Iran. "The Shah's Government was the only one that helped me materially", he said. "He gave me carpets for the mosque and money". About three-fifths of France's Muslims practice their religion. "The social pressure to worship is not as strong as in a Muslim country and the conditions are not favourable" Si Hamza Boubakeur said. "But many Muslim workers observe Ramadan even on the assembly line".

TIMES (London) March 5, 1978

آگئے ہے۔ فرانس کے ۱۰ صوبائی مرکزوں میں مستقل اماموں کے ساتھ مساجد قائم ہیں۔

رومن کیتھولک چرچ اکثر تین چوتھائی خالی رہتے ہیں۔ مگر پیرس کی مسجد میں جمعہ کی نمازوں میں پانچ ہزار سے چھ ہزار تک آدمی جمع ہو جاتے ہیں۔ وہ آنگن اور ملحقہ کمروں تک بھرے ہوتے ہیں تاکہ نماز اور خطبہ کو لاؤڈ اسپیکر پر سن سکیں۔

عید الفطر کا تیوہار جو رمضان کے ختم پر ہوتا ہے، اس میں نمازیوں کا اجتماع گیارہ ہزار تک پہنچ جاتا ہے۔ مسجد کے چاروں طرف سڑکوں پر لوگ جھکے ہوئے عبادت کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔

اندازہ ہے کہ فرانس میں ۴۱ ملین عامل کیتھولک ہیں، بمقابلہ بپتسمہ لینے والے کیتھولک کے کہ ان کی تعداد زیادہ ہے۔ مسلمان دوسرے نمبر پر ہیں جن کی تعداد تقریباً دو ملین ہے۔ اس کے بعد پروٹسٹنٹ ہیں جن کی تعداد ۱۲۵۰۰۰۰ ہے۔ یہودیوں کی تعداد نو لاکھ ہے اور بدھسٹ کی تعداد ۸۰ ہزار ہے۔

۱۹۳۹ء سے پہلے مسلم آبادی فرانس میں اتنی کم تھی کہ ان کے بارے میں کوئی سرکاری اعداد و شمار موجود نہ تھے۔ مگر دوسری عالمی جنگ کے بعد مسلم آبادی بڑھنا شروع ہوئی۔ بہت سے مسلم خاندان فرانس میں آباد ہو گئے، خاص طور پر شمالی افریقہ کے فرانسیسی مقبوضات کے۔ بعض اوقات ان کو خوف و ہراس کی حالت میں رہنا پڑتا تھا۔

۱۹۵۴ء کے بعد مہاجرین کا سیلاب بہت تیزی سے بڑھا۔ یہ سلسلہ ۱۹۷۰ء تک جاری رہا۔ شمالی افریقہ سے آنے والے مسلم خاندانوں کے علاوہ مسلمانوں کی بہت بڑی تعداد سیاہ افریقہ سے بھی فرانس میں داخل ہوئی۔ اب فرانس کے مسلمان زیادہ تر مزدور طبقہ سے تعلق رکھتے ہیں۔ ان میں سے تقریباً ۲۵۰۰۰۰ پیرس کے علاقہ میں رہتے ہیں۔ مارسیلز میں ۵۰۰۰۰ مسلمان ہیں اور لیونس میں ۳۰۰۰۰۔ ان میں سے کچھ پروفیسر ہیں۔ دوسرے وہ ہیں جو لکھ پڑھ نہیں سکتے۔ واحد چیز جو ان میں مشترک ہے وہ اسلام کا عقیدہ ہے۔

حمزہ ابوبکر پیرس کی مسجد کے مسلم انسٹی ٹیوٹ کے ریکٹر ہیں۔ مسلمانوں کے اس مختلف النوع طبقہ کے بارے میں گفتگو کرتے ہوئے انھوں نے کہا: میں نے محسوس کیا کہ میں ان لوگوں کے مذہبی اختلافات کو ختم نہیں کر سکتا۔ اس کے بجائے مجھے چاہیے کہ سب کو مشترک روحانی خوراک دینے کی کوشش کروں جو کسی ایک کے فرقہ وارانہ مزاج سے آزاد ہو۔

ان کے سامنے بہت سے مادی مسائل بھی ہیں۔ رہائش، روزگار، تعلیم اور فرانس کے معاشرہ سے موافقت۔ عورتیں جن کے اوپر خاندانی ڈھانچہ قائم ہوتا ہے، وہ ابتداءً اپنے کو ایک قسم کی لسانی قید میں پاتی ہیں۔ وہ خارجی دنیا سے ربط قائم نہیں کرپاتیں۔

حسن ابوبکر کے کمرہ کی دیوار پر شاہ ایران کی ایک تصویر ہے۔ "شاہ کی حکومت پہلی حکومت تھی جس نے مادی طور پر میری مدد کی۔" انھوں نے کہا۔ "انھوں نے مجھ کو مسجد کے لیے قالین اور پیسہ دیا۔"

فرانس کے مسلمانوں کی ۵٪ تعداد مذہبی فرائض ادا کرتی ہے۔ "عبادت کے لیے سماجی دباؤ یہاں اتنا زیادہ نہیں جتنا ایک مسلم ملک میں ہوتا ہے اور حالات زیادہ موافق نہیں ہیں۔" حسن ابوبکر نے کہا۔ "مگر بہت سے مسلم مزدور رمضان کے روزے رکھتے ہیں حتی کہ پورے مہینے تک کے۔"

موریطانیہ، افریقہ کے شمال مغربی ساحل پر ایک صحرائی ملک ہے۔ اس کا رقبہ گیارہ لاکھ مربع کیلومیٹر ہے، فرانس اور اسپین کے مجموعی رقبہ کے برابر۔ مگر آبادی صرف پندرہ لاکھ ہے۔ زیادہ تر باشندے مسلمان ہیں۔ ۱۹۶۰ء میں یہ ملک فرانس کے قبضہ سے آزاد ہوا۔ اس وقت سے یہاں صدر مختار اولد دادا (۵۴) کی حکومت تھی۔ ۱۰ جولائی کو فوجی انقلاب ہوا اور کرنل مصطفٰے اولد سالک (۴۲) نے اقتدار پر قبضہ کرلیا۔ کرنل مصطفٰے موریطانیہ کی فوج کے سربراہِ اعلیٰ تھے۔

موریطانیہ کی اقتصادیات کا انحصار زیادہ تر لوہے کی کانوں پر ہے جو یہاں بڑی مقدار میں پائی جاتی ہیں۔ ان کانوں کا سارا انتظام فرانسیسی کمپنی کے ہاتھ میں ہے۔ یہ کمپنی خام لوہا نکال کر اس اس کو نہایت سستی قیمت پر حکومت موریطانیہ سے خریدتی ہے اور اس کو مہنگی قیمت پر باہر فروخت کرتی ہے۔ فرانس کے کارخانوں میں پہنچ کر جب یہ خام لوہا مشینوں اور سامانوں کی صورت اختیار کرتا ہے تو اس کی قیمت، ابتدائی قیمت کے مقابلہ میں کئی سو گنا بڑھ جاتی ہے۔

آزادی کے بعد ہی سے موریطانیہ میں صدر مختار کے خلاف سیاسی تحریک چل رہی تھی جو بالآخر فوجیوں کے ہاتھوں اٹھارہ برس بعد کامیاب ہوئی۔ مگر اس مدت میں سارے موریطانیہ میں کوئی ایسا رہنما نہ اٹھا جو موریطانیہ کے باشندوں کو تعلیم و تربیت کے ذریعہ اس قابل بنانے کی کوشش کرتا کہ وہ اپنی لوہے کی دولت کو فرانسیسیوں سے "چھین" سکیں۔ اپنی قومی حکومت سے سیاسی اقتدار چھیننے میں انھوں نے تیزی دکھائی۔ مگر فرانسیسیوں سے اقتصادی اقتدار چھیننے کا کوئی منصوبہ وہ نہ بنا سکے۔

یہی تقریباً تمام مسلم ملکوں کا حال ہے۔ ہر رہنما سیاسی کارروائیوں میں دلچسپی دکھا رہا ہے۔ مگر ملک و قوم کی تعمیر و استحکام کے منصوبوں سے ان کو دلچسپی نہیں۔ اس کی وجہ غالباً یہ ہے کہ سیاسی کارروائی کے لیے شور و شر کے سوا کسی اور چیز کی ضرورت نہیں۔ جب کہ قومی تعمیر کے لیے خاموش محنت کی ضرورت ہے۔ پہلی صورت میں فی الفور آدمی کی اپنی شخصیت چمکتی ہے جب کہ دوسری صورت میں آدمی کو اپنے آپ کو گمنامی میں دفن کرنا پڑتا ہے۔

آسٹریلیا کا بڑا حصہ صحرا ہے۔ انیسویں صدی کے نصف آخر میں جب کہ یہاں ریلوے لائن نہیں تھی، صحرائی جہاز (اونٹ) یہاں کے راستوں کو طے کرنے کے لیے بہت مفید سمجھے گئے۔ صحرائی برِ اعظم کی اس ضرورت نے مسلمانوں کو آسٹریلیا میں روزگار فراہم کیے۔ مگر جب آسٹریلیا میں ریلوے لائن بچھ گئی تو اس کے بعد مسلمانوں کے لیے وہاں کوئی روزگار نہ رہا۔ روایتی ماحول میں اونٹوں کی نکیل تھامنے کا کام تھا اور مسلمان اس کی بخوبی مہارت رکھتے تھے۔ غیر روایتی ماحول میں مشینوں کا ہینڈل پکڑنا تھا، مسلمان اپنے کو اس کا اہل ثابت نہ کر سکے ——— قدیم زمانہ میں جو لوگ انسانی قافلوں کے آگے چلتے تھے، جدید دنیا میں وہ صرف پیچھے چلنے والے ہو کر رہ گئے۔

۱۸۶۰ء میں ایک مسلمان آسٹریلیا میں داخل ہوا تھا۔ آج آسٹریلیا میں مسلمانوں کی تعداد تقریباً ایک لاکھ ہے۔ ملک میں جگہ جگہ نئی نئی مسجدیں بن رہی ہیں۔ ابتدا میں جو مسلمان آسٹریلیا پہنچے وہ شتربان (Camel Driver) تھے جو اونٹوں کی نگہداشت اور ساربانی کے لیے یہاں لائے گئے تھے۔ ۸۰ سال سے زیادہ عرصہ تک مسلمان اسی حیثیت سے آسٹریلیا میں رہے۔

پہلا مسلمان شخص جو آسٹریلیا پہنچا، اس کا نام دوست محمد تھا۔ وہ ایک کشمیری پٹھان تھا۔ اس کے ساتھ ۲۴ اونٹوں کا قافلہ ہوتا تھا اور وہ ملبورن اور برک کے درمیان اونٹوں کے ذریعہ سواری اور باربرداری کا کام کیا کرتا تھا۔ ۱۸۶۶ء میں سر ٹامس ایلڈر نے ۱۲۰ اونٹوں کا قافلہ بنایا۔ اس کو ساربانوں کی ضرورت تھی۔ چنانچہ اس نے کراچی سے ۱۲ ساربانوں کو بلایا۔ اسی طرح افغانستان، ہندستان اور موجودہ پاکستان سے ساربانی کے کام کے لیے مسلمان آسٹریلیا پہنچتے رہے۔

آسٹریلیا کے لوگ ان مسلمانوں کو عام طور پر "افغان" کہتے تھے جو مختصر ہوتے ہوتے بالآخر صرف غان (Ghans) رہ گیا۔ اونٹوں کے ذریعہ سواری اور باربرداری کا کام اتنا بڑھا کہ ایک باریک وقت

پانچ سو اونٹ باہر سے منگوائے گئے۔ یہ ساربان اپنے مخصوص پیشہ کے ساتھ بعض معمولی تجارتی کام بھی آسٹریلیا میں کرتے تھے۔

اونٹوں کے قافلے زیادہ تر ایڈیلیڈ، فارینا، ماری اوڈناڈٹا اور الائس کے راستوں پر چلتے تھے۔ اس پورے راستہ میں ان لوگوں نے جگہ جگہ عبادت کے لیے مسجدیں بنالیں۔ اسی طرح دوسرے جن راستوں پر وہ چلتے تھے، وہاں وہ مسجد بھی بنا لیتے تھے۔ یہ لوگ ہمیشہ اپنے ساتھ چٹائیاں بھی رکھتے اور جہاں مسجد نہ ہوتی، راستہ کے کنارے چٹائی بچھا کر نماز پڑھ لیتے۔

۱۸۷۰ء کے بعد آسٹریلیا کے صحراؤں میں ریلوے لائن کا منصوبہ بنا اور بالآخر ٹرانس آسٹریلیا ریلوے وجود میں آئی۔ اس ریلوے لائن کے لیے سروے کا جو کام برسہابرس تک ہوتا رہا، اس میں مسلم ساربانوں کے اونٹ بہت کارآمد ثابت ہوئے۔ ان اونٹوں کے ذریعہ سرکاری کارکن اور سامان صحراؤں میں سفر کرتے تھے۔ مگر جب ریلوے لائن بن گئی تو یہی ریلوے تھی جس نے آسٹریلیا میں اونٹوں کو اور اسی کے ساتھ مسلمانوں کو بے جگہ کر دیا۔ اس کے بعد یہ کاروبار ختم ہونے لگا۔ مسلمان آسٹریلیا سے رخصت ہونے لگے۔ آدر مان خان آخری مسلمان تھا جو ۱۹۵۰ء میں آسٹریلیا کو چھوڑ کر اپنے وطن کراچی واپس آگیا۔ اس نے تقریباً ۵۰ سال آسٹریلیا میں گزارے۔

پھر بھی بعض خوش قسمت مسلمانوں کو آسٹریلیا میں روزگار ملتا رہا۔ مثلاً ۱۹۷۵ء میں آسٹریلیا کی حکومت نے فیصلہ کیا کہ وہ چار اونٹ شاہ خالد (سعودی عرب) کی خدمت میں پیش کرے۔ اس کے لیے حکومت نے محمد عالم اور صالح محمد کی خدمات حاصل کیں، جنھوں نے سمپسن صحراؤں سے چار جنگلی اونٹ پکڑے اور ان کو تربیت دے کر اس قابل بنایا کہ وہ سعودی حکمراں کو بطور تحفہ پیش کیے جاسکیں۔

مسلم ساربانوں کی خاص شاہراہ وہ تھی جو ایڈیلیڈ سے الائس اسپرنگ کو جاتی ہے۔ اس راستہ پر اب جدید وضع کی ٹرینیں دوڑتی ہیں۔ تاہم قدیم "افغانی ساربانوں" کے نام پر اس کا نام غان (The Ghan) رکھا گیا ہے۔ اس قسم کی اور بھی یادگاریں ہیں۔ ایڈیلیڈ میں "افغانوں" نے ۱۸۸۹ء میں ایک مسجد بنائی تھی۔ اس علاقہ میں اب اگرچہ مسلمان نہیں ہیں۔ مگر بروکن ہل ہسٹاریکل سوسائٹی نے ۱۱۵ سال بعد بھی اب تک اس کو محفوظ رکھا ہے۔ اب مسجد کے ساتھ جلد ہی "افغان میموریل ہال" حکومت کے اہتمام میں بننے والا ہے۔ یہ ہال اور اس قسم کی دوسری چیزیں دراصل اس بات کا

نشان ہیں کہ آسٹریلیا مسلم ملکوں خاص طور پر عربوں سے تعلقات بڑھا رہا ہے۔ پٹرول نے آج کی دنیا میں عربوں کی اہمیت بڑھا دی ہے اور اسی کے ساتھ اسلام کی بھی۔

۱۹۵۱ء سے مسلمانوں کی نئی قسم آسٹریلیا میں داخل ہونا شروع ہوئی ہے۔ یہ مختلف ملکوں کے طلبہ ہیں۔ ۱۹۷۸ میں ان کی تعداد تقریباً پانچ ہزار تھی۔ اسی طرح مسلم سفارت خانوں کا عملہ بھی مسلمانوں کی تعداد بڑھا رہا ہے۔ برسبین (Brisbane) میں ۱۹۰۷ء میں ایک مسجد بنائی گئی تھی جو اب خستہ حالت میں تھی۔ اب یہاں کے مسلم طلبہ نے اس کی نئی تعمیر کا منصوبہ بنایا۔ اس کی لاگت کا اندازہ ۵۰ ہزار آسٹریلیائی ڈالر تھا۔ مسجد ۱۹۷۰ میں بن کر تیار ہوگئی مگر اس کی لاگت اصل اندازہ کے مقابلہ میں صرف نصف رہی۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ مقامی مسلمانوں نے رضاکارانہ طور پر مزدوروں کا کام کیا۔

سڈنی نہ صرف آسٹریلیا کا سب سے بڑا شہر ہے بلکہ یہاں مسلم آبادی بھی سب سے زیادہ ہے۔ یہاں مسلمانوں کی تعداد تقریباً ۵۰ ہزار ہے۔ آسٹریلیا کی سب سے بڑی مسجد بھی جلد ہی یہاں مکمل ہو جائے گی۔ اس کی لاگت کا اندازہ پانچ لاکھ آسٹریلیائی ڈالر ہے۔ اسی طرح ملبورن میں پانچ لاکھ آسٹریلیائی ڈالر کی لاگت سے ایک مسجد تیار ہوئی ہے۔ اس کی لاگت زیادہ تر بیرونی مسلم ملکوں کے عطیات سے پوری کی گئی ہے۔ مثلاً صباح، سعودی عرب، بحرین، کویت۔

سعودی عرب نے آسٹریلیا میں مساجد کی تعمیر کے لیے خصوصی طور پر پچاس ہزار ڈالر کی رقم دی ہے۔ آسٹریلیا کے مختلف مقامات پر جو مساجد ہیں، ان کا نقشہ اگلے صفحہ پر دیا جا رہا ہے۔

یہ معلومات آسٹریلین ہائی کمیشن کے ایک بلٹین سے لی گئی ہیں جو اپریل ۱۹۷۸ میں دہلی سے شائع کیا گیا ہے۔ بلٹین کا عنوان ہے:

Muslims in Australia
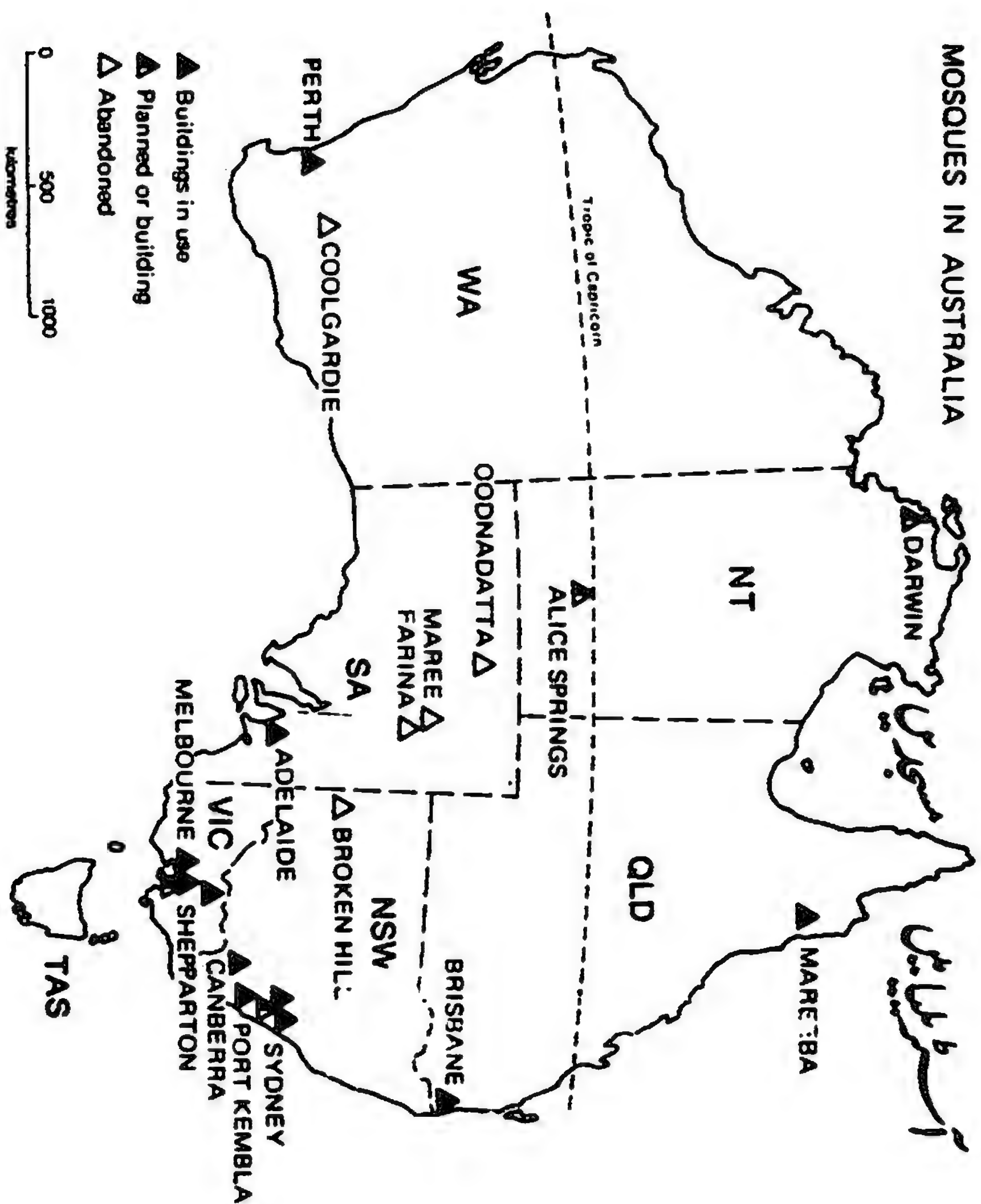
اسلام کی طاقت

انجیل میں پیغمبر اسلام ؐ کے بارے میں جو پیشین گوئیاں ہیں، ان میں سے ایک یہ ہے :
ومن فمہ یخرج سیف ماض لکی یضرب بہ الامم (یوحنا عارف کا مکاشفہ ۱۹ : ۱۵) اور قوموں کو مارنے کے لیے اس کے منہ سے ایک تیز تلوار نکلتی ہے۔

اس کا مطلب یہ ہے کہ پیغمبر آخر الزماں ؐ کو جو دین دیا جائے گا اس کی طاقت لوہے کی تلوار نہیں ہوگی بلکہ الفاظ کی تلوار ہوگی۔ وہ نظریاتی طاقت سے قوموں کو زیر کرے گا۔ وہ اس قوت کے ذریعہ کام کرے گا جو زبان سے نکلتی ہے نہ کہ وہ قوت جو کانوں سے اور زمین کی تہوں سے برآمد ہوتی ہے۔

یہ ایک عظیم الشان پیشین گوئی ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ آخری رسول ؐ کے ذریعہ جو دین دیا گیا ہے، اس کے حاملین کے لیے کبھی نہتا یا بے وسیلہ ہونے کا سوال نہیں۔ وہ اس وقت بھی، امکانی طور پر، اعلیٰ ترین طاقت سے مسلح ہوں گے جب کہ ہر قسم کی ظاہری طاقتیں ان سے چھن چکی ہوں گی۔ کیونکہ ان کی طاقت کا راز ان کے دین کی نظریاتی صداقت میں ہے۔ اور یہ وہ چیز ہے جس کو ان سے کوئی چھین نہیں سکتا۔

یہ پیشین گوئی پیغمبر اسلام کی زندگی میں اپنی مکمل شکل میں پوری ہو چکی ہے۔ آپ کی زبان پر اللہ نے اپنا جو کلام جاری کیا، اس نے قدیم آباد دنیا کے تقریباً پورے علاقہ کو زیر و زبر کر ڈالا۔ کلامِ الٰہی کی یہ طاقت آج بھی اپنا کرشمہ دکھا سکتی ہے، بشرطیکہ پیغمبر اسلام ؐ کے امتی اس کو لے کر اسی طرح اٹھیں جس طرح ان کے پیش رو اس کو لے کر اٹھے تھے۔

اسلام کی یہ طاقت جس نے قدیم زمانہ میں عظیم الشان پیمانہ پر اپنے اثرات ظاہر کیے تھے، موجودہ زمانہ میں وہ بے اثر کیوں ہو گئی ہے۔ اس کی نفوذ کی صلاحیت کیوں اپنا اثر نہیں دکھاتی۔ اس کی وجہ خود اسلام کے حاملین ہیں۔ مسلمانوں نے اسلام کی فطری کشش پر اپنے عمل سے پردہ ڈالا ہے۔ انھوں نے سیدھے دین کو ٹیڑھا دین بنا رکھا ہے، پھر لوگ کیوں کر اس کی طرف مائل ہوں۔

نئے امکانات

سفر کی سہولتوں نے موجودہ زمانہ میں بین اقوامی سیاحت کو ایک مستقل انڈسٹری بنا دیا ہے۔ آج جو لوگ ایک ملک سے دوسرے ملک میں سفر کرتے ہیں، ان میں بڑی تعداد سیاحوں کی ہوتی ہے۔ ہندستان میں پچھلے چند برسوں کے اعداد و شمار کا جو تجزیہ کیا گیا ہے، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ملک کے اندر آنے والے سیاحوں میں تہائی کی تعداد میں وہ لوگ تھے جن کی عمریں ۱۷ سال اور ۳۰ سال کے درمیان تھیں۔ ان میں بھی ۲۷ فی صد وہ نوجوان تھے جو اپنے اپنے ملکوں میں زیر تعلیم ہیں یہ سیاحت کی دنیا میں ایک نئی چیز ہے۔ کیونکہ اس سے پہلے اس قسم کی سیاحت کے لئے زیادہ تر بوڑھے لوگ نکلا کرتے تھے۔

سیاحوں کی فہرست میں نوجوانوں کا اضافہ بہت معنی خیز ہے۔ جوانی کا زمانہ جوش و خروش کا زمانہ ہے۔ اس زمانہ میں زندگی امنگوں اور حوصلوں سے لبریز ہوتی ہے۔ وہ کچھ کرنا چاہتے ہیں۔ تحقیق سے یہ بھی معلوم ہوا ہے کہ یہ نوجوان، قدیم سیاحوں سے مختلف ہیں اور کچھ نئی چیزوں کے طالب ہیں۔ قدیم سیاح آرام دہ ہوٹل، ایرکنڈیشنڈ کار اور کھانے پینے کے عمدہ انتظام کا مطالبہ کرتے تھے۔ یہ نوجوان سیاح ان چیزوں کی پرواہ نہیں کرتے وہ اوسط درجہ کے انتظام پر بالکل مطمئن ہو جاتے ہیں۔ وہ آرام اور فیشن کی تلاش سے زیادہ یہ چاہتے ہیں کہ ان کے لئے ڈاکومنٹری فلم، کلچر اور تعلیم یافتہ گائڈ کا انتظام ہو، جو ان کو ملک کی تہذیبی وراثت کے بارے میں زیادہ سے زیادہ معلومات دے سکے۔

اس کا ذکر کرتے ہوئے ایک اخبار نے اپنے اڈیٹوریل میں لکھا تھا: "یہ نئے قسم کے سیاح محض تماش بیں نہیں ہیں جو وقت گزاری کی خاطر یہاں آتے ہیں۔ ان کے اندر علم کی پیاس ہے۔ وہ ہندوستان کے آرٹ اور کلچر کے بارے میں جاننا چاہتے ہیں۔"

انڈین اکسپرس، ۸ مارچ ۱۹۷۲

یہ دراصل اس عام رد کا ایک نمونہ ہے جو ساری دنیا میں نئی نسل کے اندر پیدا ہو گیا ہے۔ آج کی نئی نسل، خاص طور پر ترقی یافتہ ملکوں کی نئی نسل، اپنے ماحول سے غیر مطمئن ہے۔ یہ ماحول اس کو مادی مواقع دیتا ہے۔ مگر اس کے ذہنی اور روحانی سوالات کا جواب اس میں نہیں ملتا۔ چنانچہ جدید دنیا میں عام طور پر ماضی کی طرف دیکھنے کا ذہن ابھر رہا ہے جب کہ انسانی سماج مشین کی پیدا کردہ الجھنوں سے پاک تھا۔ آج کا انسان یہ سمجھتا ہے کہ جس سوال کا جواب حال میں موجود نہیں، اس کا جواب شاید ماضی کے خزانہ میں اسے مل جائے۔ یہی وجہ ہے کہ مشرق میں مغربی سیاحوں کی آمد بڑھ رہی ہے کیونکہ وہ سمجھتے ہیں کہ مشرق میں وہ ماضی ابھی تک محفوظ ہے جو مغرب میں بڑی حد تک ضائع ہو چکا ہے۔

اس صورت حال نے مذہب کی تبلیغ و اشاعت کا ایک نیا دروازہ کھول دیا ہے۔ مزید یہ کہ بین اقوامی سیاحی نے مدعو کو خود داعی کے پاس پہنچا دیا ہے۔ جن لوگوں کو پانے کے لئے ہمیں سمندر پار کا سفر کرنا پڑتا وہ خود ہمارے قریب آکر کھڑے ہو گئے ہیں۔ مگر داعیوں کا حال یہ ہے کہ مسلم تاریخی مقامات پر آنے والے سیاحوں کو وہ اپنے لئے تجارت کا مال سمجھتے ہیں، نہ کہ دعوت کا موضوع۔ دہلی کی جامع مسجد میں نماز کے اوقات میں ان کے لئے داخلہ ممنوع ہے۔ حالاں کہ اس وسیع مسجد میں اگر نماز کے وقت غیر مسلم آئیں اور قرآن کے بتائے ہوئے طریق عبادت کو دیکھیں تو یہ ان کو اللہ کا پیغام پہنچانے کے ہم معنی ہوگا اور اس حکم خداوندی کی تعمیل ہوگی جو سورہ توبہ آیت ۶ میں بیان کیا گیا ہے۔

رابطۂ عالمی اسلامی (مکہ) نے دو سو صفحات پر مشتمل ایک عربی کتاب شائع کی ہے جس کا نام ہے:
لماذا اسلمنا (ہم نے اسلام کیوں قبول کیا) اس کتاب میں موجودہ زمانہ کے ۴۲ نومسلموں نے خود اپنے قلم سے اپنے حالات لکھے ہیں۔ ان میں سے چند جاپانی ہیں۔ ان لوگوں نے نہایت شدت اور یقین کے ساتھ اس خیال کا اظہار کیا ہے کہ جاپان میں اسلام کی اشاعت کے غیر معمولی امکانات ہیں۔

علی محمد موری جاپانی لکھتے ہیں کہ جاپان جغرافی طور پر روس اور امریکہ کے درمیان پایا جاتا ہے اس لیے دونوں بلاک جاپانی قوم کے اندر اپنے اثرات پھیلانے کی کوشش کر رہے ہیں۔ مگر دونوں میں سے کوئی بھی کامیاب نہیں۔ کیوں کہ جاپان کے روحانی سوال کا جواب ان میں سے کسی کے پاس نہیں ہے۔ دوسری جنگ عظیم کے بعد جاپانی نوجوانوں میں نئے آدرش کی تلاش کا جذبہ شدت سے ابھرا۔ اس موقع سے عیسائی مبلغین نے فائدہ اٹھایا اور جاپان کی نئی نسل میں عیسائیت پھیلنے لگی۔ مگر بہت جلد وہ اس سے متوحش ہو گئے۔ کیوں کہ انھیں محسوس ہوا کہ عیسائی مشنریوں کے پیچھے برطانوی اور امریکی استعمار کے مقاصد کام کر رہے ہیں (۱۵۴)

عمر یتا جاپانی جنھوں نے جاپانی زبان میں قرآن کا ترجمہ کیا ہے، لکھتے ہیں کہ جاپان میں اسلام کے لیے ایک عظیم مستقبل ہے، جاپانی قوم سچے دین کی پیاسی ہے وہ کسی مذہبی تعصب میں بھی گرفتار نہیں۔ اس لیے اگر اس کے سامنے دین فطرت کو پیش کیا جائے تو وہ بہت تیزی سے اس کی طرف بڑھے گی۔ انھوں نے دنیا کے مسلمانوں سے اپیل کی ہے کہ وہ ایسے افراد کو جاپان بھیجیں جو اس قوم کو خدا کا سچا پیغام پہنچا سکیں۔ (۱۵۱)

محمد سلیمان تاکیوتشی جاپانی لکھتے ہیں کہ جاپان کے موجودہ حالات اسلام کی اشاعت کے لیے انتہائی موزوں ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ جاپان مادی ترقی کی انتہا پر پہنچ کر روحانی مایوسی سے دوچار ہے۔ کیوں کہ یہ ترقیاں اس کی روح کو تسکین نہ دے سکیں۔ وہ کہتے ہیں کہ جاپان میں مناسب انداز سے اسلام کی اشاعت کی جائے تو صرف دو تین نسلوں میں سارے ملک میں اسلام پھیل جائے۔ اور اگر ایسا ہو جائے تو یہ شرق اقصیٰ میں اسلام کی عظیم نصرت کے ہم معنی ہوگا اور بالآخر ساری نوع انسانی تک اس کے اثرات پہنچیں گے۔ (۱۶۷)

"فرانسیسی مفکر اینڈری مالرو نے کہا ہے کہ یورپ کا عروج ۱۴۵۰ء میں شروع ہوا۔ یہ دور پانچ سو برس تک رہا۔ ۱۹۴۹ء میں ماؤ کا برسراقتدار آنا اس دور کے خاتمہ کا اعلان تھا۔ مغربی تہذیب جس طرح رومی تہذیب کے خاتمہ کے بعد پیدا ہوئی تھی، اسی طرح اب وہ کسی آنے والی تہذیب کے لئے جگہ خالی کر رہی ہے۔ (ٹائم، ۸ر اپریل ۱۹۷۴ء)

مستقبل قریب میں مغربی تہذیب کا انہدام یقینی ہے۔ اس کے بعد ساری دنیا ایک فکری خلا سے دوچار ہوگی جس کو پُر کرنے کے لئے اس وقت کوئی قوم موجود نہیں ہے۔ چین اور روس بظاہر دورِ جدید کے طاقت ور دیو بن کر ابھرے ہیں۔ مگر وہ اس خلا کو پُر نہیں کر سکتے۔ اس کی وجہ ان کا اندرونی تضاد ہے۔ اشتراکی ڈکٹیٹرشپ جس نے ان ملکوں کو موقع دیا ہے کہ وہ اپنے وسائل کو مخصوص میدانوں میں مرتکز کر کے طاقت ور قوم بن جائیں، وہی اس میں مانع ہے کہ ان ملکوں میں کوئی فکری ارتقار وجود میں آسکے۔ کلیت پسندانہ نظام کے تحت ٹکنکل علوم ترقی کر سکتے ہیں، مگر فکری علوم، جو قوموں کو امامت کا مقام دیتے ہیں، ان کی ترقی کے لئے آزاد فضا ناگزیر طور پر ضروری ہے جو اشتراکی نظام میں موجود نہیں ہوتی۔

اس کے بعد جاپان ہے۔ بلاشبہ جاپان نے صنعتی ترقی کے میدان میں معجزنما کارنامے دکھائے ہیں۔ مگر جاپان بنیادی طور پر ایک ٹکنکل معاشرہ ہے اور مستقبل بعید تک یہ امید نہیں کہ وہ فکری حیثیت سے کوئی مقام حاصل کر سکے۔

مغربی قوموں کا انہدام، صنعتی تہذیب کے نتائج سے مایوسی اور عمومی فکری خلا نے دینِ حق کے حاملین کو آج اس مقام پر کھڑا کر دیا ہے کہ اگر وہ بیدار ہو جائیں تو اسلام کو دوبارہ نوعِ انسان کی امامت کے مقام پر پہنچا سکتے ہیں

اس اعلیٰ مقصد کے لئے جد و جہد میں جو واحد چیز رکاوٹ بن سکتی تھی، وہ جدید صنعتی دور میں وسائل کے اعتبار سے ان کا پیچھے ہونا ہے۔ تاہم قدرت نے تیل کے ذخائر کا تین چوتھائی حصہ ان کی زمین کے نیچے رکھ کر حیرت انگیز طور پر ان کی پس ماندگی کی تلافی کر دی ہے۔ آج مسلم دنیا ہر وہ اقتصادی قیمت ادا کر سکتی ہے جو دورِ جدید میں اسلام کے احیار کی مؤثر جد و جہد کے لئے درکار ہے۔ خدا نے اپنے حصہ کا کام کر دیا ہے اب دیکھنا یہ ہے کہ اس کے بندے اپنے حصہ کا کام کرتے ہیں یا نہیں۔" (ماخوذ از "الاسلام" صفحہ ۲۳۵ - ۳۷)

سیاحت

سیاحت موجودہ زمانہ میں ایک عظیم انڈسٹری ہے۔ چنانچہ اس سلسلہ میں مختلف قسم کے اعداد و شمار نہایت اہتمام کے ساتھ جمع کئے جاتے ہیں۔ ہر ملک کی وزارت سیاحت ان کا خصوصی مطالعہ کرتی ہے اور ان کی بنیاد پر ترقیاتی نقشے بناتی ہے۔ جدید سیاحت کے ذریعہ انسانوں کی عالمی نقل و حرکت اتنے بڑے پیمانہ پر ہو رہی ہے جس کا اس سے پہلے تصور بھی نہیں کیا گیا تھا۔

ایک تخمینہ میں بتایا گیا ہے کہ عرب ملکوں کے سیاح ہر سال سیاحت پر جو رقم خرچ کرتے ہیں اس کی مقدار گیارہ بلین ڈالر سے اوپر ہے۔ یعنی ہندستانی سکہ میں تقریباً ایک سو دس کھرب روپیہ یہ رقم دنیا بھر میں سیاحی پر خرچ کی جانے والی کل رقم کا دس فی صد حصہ ہے۔ یورپ میں جانے والا ایک عرب اوسطاً ۸۶۰ پونڈ خرچ کرتا ہے۔ یہ دنیا کے کسی بھی ملک کی فی سیاح خرچ کی جانے والی رقم سے بہت زیادہ ہے۔

قرآن میں سیاحت کو اہل ایمان کی صفت بتایا گیا ہے۔ مگر اس سیاحت کا مقصد صرف دو ہوتا ہے۔ دنیا کے واقعات سے عبرت اور نصیحت لینا یا دعوت و تبلیغ کرنا۔ گویا مومن کی سیاحت دینی سیاحت ہوتی ہے نہ کہ تفریحی سیاحت۔

موجودہ زمانہ میں مسلمانوں، خصوصاً عربوں کو اللہ تعالیٰ نے یہ موقع دیا ہے کہ وہ دنیا بھر میں سفر کریں اور اس کی ہر ممکن قیمت ادا کر سکیں۔ اگر مسلمانوں کے اندر صحیح شعور زندہ ہو تو یہ موقع ان کے لئے زبردست دینی فائدہ کا ذریعہ بن جائے۔

مگر موجودہ حالت میں مسلمانوں کو بے پناہ رقم خرچ کرنے کے باوجود نہ پہلا فائدہ حاصل ہو رہا ہے اور نہ دوسرا فائدہ۔ دنیا بھر کی سیاحت کے باوجود نہ وہ دنیا سے عبرت اور نصیحت کی غذا حاصل کر سکے۔ اور نہ دنیا کے سامنے خدا کے دین کی گواہی دے سکے۔

اس کی وجہ مسلمانوں کی بے مقصدیت ہے۔ آج مسلمانوں کے سامنے کوئی اونچا مقصد نہیں، اس لئے وہ یہ بھی نہیں جانتے کہ جدید مواقع کو وہ کس طرح اپنے حق میں استعمال کریں۔ موجودہ زمانہ میں مسلمانوں کے قائدین نے انھیں صرف جھوٹے فخر کی غذا دی ہے۔ اور جھوٹا فخر بلاشبہ سب سے زیادہ بری خوراک ہے جو اس دنیا میں کسی کو دی جا سکتی ہے۔ جن لوگوں کے ذہن میں جھوٹا فخر سما جاتا ہے وہ اپنے آپ کو کچھ کرنے سے فارغ سمجھ لیتے ہیں۔ وہ چاہنے لگتے ہیں کہ ان کے لئے کیا جائے نہ کہ وہ دوسروں کے لئے کریں۔

جاپان میں دعوت

۲۶ اپریل ۱۹۹۱ کو جناب عبد القادر خاں صاحب (پیدائش ۱۹۳۶) سے ملاقات ہوئی وہ بمبئی میں رہتے ہیں (Tel. 2615016) انھوں نے بتایا کہ وہ بین اقوامی نمائش (Expo 70) کو دیکھنے کے لئے ۱۹۷۰ میں جاپان (ٹوکیو) گئے تھے۔ وہاں وہ ایک ہفتہ تک رہے۔

وہ اپنے گروپ کے ساتھ ٹوکیو ایئر پورٹ پر اترے تو وہاں کچھ جاپانی باشندے پہلے سے موجود تھے۔ انھوں نے پیش کش کی کہ آپ میں سے جو صاحب ہمارے ساتھ قیام کرنا پسند کریں، ان کو ہم اپنے گھر لے جانے کے لئے تیار ہیں۔ عبد القادر خاں صاحب جاپانیوں کو قریب سے دیکھنا چاہتے تھے۔ چنانچہ اس پیش کش کو قبول کرتے ہوئے وہ ایک جاپانی کے ساتھ چلے گئے۔

عبد القادر صاحب کو ایک ہفتہ تک اس جاپانی خاندان کے ساتھ رہنے کا موقع ملا۔ دن کا بیشتر وقت باہر نمائش وغیرہ دیکھنے میں گزرتا۔ شام کو وہ جاپانی کے گھر آجاتے اور رات اس کے یہاں گزارتے تھے۔ چوں کہ جاپانی نے اپنے گھر ٹھہرانے کے لئے کوئی معاوضہ نہیں لیا تھا، ان کو خیال ہوا کہ وہ انھیں کوئی تحفہ دیں۔ چنانچہ انھوں نے ٹوکیو میں جاپانی ساخت کا ایک کیمرہ خریدا اور اس کو اپنے میزبان کے بچہ کو بطور تحفہ پیش کیا۔

جاپانی میزبان نے تحفہ قبول کر لیا۔ اس کے بعد اس نے کہا کہ یہ کیمرہ آپ نے جہاں سے خریدا ہے، اس نے آپ کو اس کی رسید دی ہوگی۔ انھوں نے کہا کہ ہاں۔ جاپانی نے بہت نرمی اور شرمندگی کے ساتھ کہا کہ بڑی مہربانی ہوگی اگر آپ وہ رسید ہم کو دے دیں۔ چنانچہ عبد القادر صاحب نے وہ رسید انھیں دے دی۔

تاہم عبد القادر صاحب کے ذہن میں یہ سوال تھا کہ جاپانی نے کیوں ایسا کیا۔ آخر رسید کو لے کر وہ اس کو کیا کرے گا۔ انھوں نے معافی مانگتے ہوئے اپنے جاپانی میزبان سے کہا کہ اگر کوئی ہرج نہ ہو تو آپ مجھے یہ بتانے کی زحمت گوارا کریں کہ کیمرہ کی رسید کیوں آپ نے طلب فرمائی۔

جاپانی نے کہا کہ اصل یہ ہے کہ آپ یہاں ٹورسٹ (سیاح) کے طور پر آئے ہیں۔ ہمارے ملک میں یہ قاعدہ ہے کہ ٹورسٹ لوگوں کو جاپانی مصنوعات خصوصی رعایت پر دی جاتی ہیں۔ مثلاً یہ کیمرہ

آپ کو چالیس فی صد کم قیمت پر دیا گیا ہو گا۔ یہ اس صورت میں ہے جب کہ کیمرہ ملک کے باہر جا رہا ہو۔ مگر اب یہ کیمرہ ملک کے اندر رہے گا اس لئے اب اس پر رعایت کا حق باقی نہیں رہتا۔ آپ سے یہ رسید ہم نے اس لئے لی ہے کہ ہم اس کو لے کر دکان پر جائیں گے اور وہاں اس کی بقیہ قیمت ادا کریں گے۔ تاکہ ہماری وجہ سے جاپان کا قومی نقصان نہ ہونے پائے۔

اس قسم کے واقعات بار بار الرسالہ میں آتے رہے ہیں۔ وہ جاپانیوں کے قومی کیرکٹر کو بتاتے ہیں۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ جاپانی لوگ کتنے زیادہ بااصول اور باکردار ہوتے ہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ جاپان کے باشندے اپنی فطرت پر ہیں۔ وہ اپنے فطری اوصاف پر قائم ہیں۔ اور فطری اوصاف جب شرعی اوصاف کی صورت اختیار کرلیں تو اسی کا نام اسلام ہے۔ یہی مطلب ہے اس حدیث کا جس میں فرمایا گیا ہے کہ جاہلیت میں جو لوگ بہتر ہوں وہی اسلام میں بھی بہتر ہوتے ہیں (خیارکم فی الجاھلیۃ خیارکم فی الاسلام)

ایک سفر میں میری ملاقات ایک جاپانی نومسلم سے ہوئی۔ انھوں نے کہا کہ جاپانی لوگ اپنی فطری استعداد کی بنا پر اسلام سے بہت قریب ہیں۔ جاپانی قوم بالقوہ طور پر مسلمان ہی ہے:

Japanese people are potentially Muslims.

آج سخت ترین ضرورت ہے کہ جاپانیوں تک اسلام کی دعوت پہنچائی جائے۔ مگر اس کے لئے جاپانی زبان کو جاننا بہت ضروری ہے۔ کاش ہمارے کچھ نوجوان اس مقصد کے لئے اپنے آپ کو وقف کرسکیں۔ وہ جاپانی زبان سیکھ کر اس میں بخوبی واقفیت حاصل کریں اور پھر جاپان جاکر وہاں کے لوگوں کو اسلام کی دعوت پہنچائیں۔

اسلام دین فطرت ہے۔ وہ ان لوگوں کو فوراً اپیل کرتا ہے جنھوں نے اپنی فطرت کو بچایا ہو، جنھوں نے اپنی فطرت کو بگڑنے سے محفوظ رکھا ہو۔

ایک امکان

جان پاویل (John Enoch Powell) ایک نہایت ذہین اور قابل انگریز تھے۔ وہ برطانی کیبنٹ میں وزیر صحت تھے۔ بعض اصولی اختلاف کی بنا پر انھوں نے وزارت سے استعفا دے دیا۔ وہ یونانی، لاتینی، فرانسیسی، جرمن، اطالوی اور انگریزی زبانیں جانتے تھے۔ جان پاویل آزادی سے پہلے ہندستان میں بھی رہ چکے ہیں۔ وہ برطانوی فوج میں ایک افسر تھے۔ ان کے ایک سوانح نگار نے ان کی بابت حسب ذیل الفاظ لکھے ہیں:

> Powell spent some years in India as a soldier. He travelled extensively in the country by bicycle and became in his own words "an amateur of Islamic architecture." He learned Urdu and became acquainted with Sanskirt. Of his years in India he wrote later : "I had fallen hopelessly in love with India. If in 1946, there had been a foreseeable future in the Indian army, I would have opted to leave my bones there."

پاویل نے کچھ سال ہندستان میں بطور انگریزی سپاہی کے گزارے۔ انھوں نے بائیسکل کے ذریعہ ملک میں دور دور تک کا سفر کیا۔ وہ اپنے الفاظ میں اسلامی طرز تعمیر کے عاشق ہو گئے۔ انھوں نے اردو سیکھی۔ اور سنسکرت سے واقفیت پیدا کی۔ اپنے ہندستان میں زمانۂ قیام کے بارہ میں انھوں نے بعد کو لکھا کہ میں ہندستان کی محبت میں گرفتار ہو گیا۔ اگر ۱۹۴۶ میں ہندستانی فوج کا پختگی طور پر کوئی مستقبل نظر آتا تو میں اس کو ترجیح دیتا کہ میری ہڈیاں ہندستان ہی میں رہ جائیں (ٹائمس آف انڈیا ۵ فروری ۱۹۸۴)

انگریزی دور حکومت میں اس طرح کے بے شمار انگریز تھے۔ وہ دعوت اسلام کے امکانی مدعو تھے۔ ان کی فطرت پکار رہی تھی کہ "ہمارے سامنے حق کا پیغام پیش کرو، ہم اس پر تعصب سے خالی ہو کر غور کریں گے"، مگر ہمارے قائدین کو یہ امکان نظر نہ آیا۔ کیوں کہ انھوں نے انگریز کو حریف کے روپ میں دیکھا۔ وہ ان کو مدعو کے روپ میں نہ دیکھ سکے۔ انھوں نے ان سے نفرت کی مگر وہ ان سے محبت نہ کر سکے۔ انھوں نے ان کو صرف غیر سمجھا، وہ ان کو اپنا سمجھنے کا ثبوت نہ دے سکے۔ وہ ردعمل کی نفسیات کا شکار ہو گئے اور مثبت نفسیات پر قائم ہونے والے نہیں بنے۔ حالانکہ یہ وہ وقت تھا کہ وہ اپنا کام اپنی مادری زبان اردو میں کر سکتے تھے۔

یہ غلطی اگر لیڈری کے شوق میں ہوئی تو وہ سب سے بڑا گناہ تھی اور اگر اخلاص سے ہوئی تو سب سے بڑی حماقت۔

دنیا منتظر ہے

واشنگٹن پوسٹ کے مطابق، اس وقت امریکہ میں دس کتابیں بہت زیادہ بکنے والی (bestseller) بنی ہوئی ہیں۔ ان میں سے ایک کتاب یہ ہے :

The Politics of Rich and Poor, by Kevin Phillips

اس کتاب میں مصنف بتاتے ہیں کہ اس وقت امریکہ میں غیر مساویانہ آمدنی (income disparity) کا مسئلہ بہت شدت اختیار کر چکا ہے جس کو وہ دو ساحلی معاشیات (bicoastal economy) کہتے ہیں۔ انھوں نے بتایا ہے کہ ایک طرف امریکہ میں ایک فی صد سپر مال دار (super rich) طبقہ ہے۔ اس کی آمدنی (\$5,50,000) ڈالر سالانہ ہے۔ دوسری طرف بقیہ لوگ ہیں جو یا تو بہت کم آمدنی پر زندگی گزارتے ہیں یا مذکورہ طبقہ کے مقروض ہیں۔ مصنف کہتے ہیں کہ بیسویں صدی کے آخر میں اب ہمیں ایک نئی سیاسیات (new politics) کی ضرورت ہے جو نئے امریکہ کی تعمیر کر سکے۔

یہ امریکہ کا حال ہے جو آزاد معیشت کا گڑھ سمجھا جاتا ہے۔ دوسری طرف سوویت روس کی مثال ہے جہاں مارکسی نظریہ کے مطابق پابند معیشت یا ریاستی معیشت کا تجربہ کیا گیا تھا۔ تمام ذرائع پیداوار افراد کے قبضہ سے نکال کر حکومت کے قبضہ میں دے دیے گئے۔ مگر اس تجربہ کے ستر سال بعد معلوم ہوا کہ اس نے تاریخ کی سب سے زیادہ برباد معیشت کے سوا انسانیت کو اور کہیں نہیں پہنچایا ہے۔ حتیٰ کہ آج روسی حکومت امریکہ اور دوسرے آزاد ملکوں سے ۲۰ بلین ڈالر قرضہ مانگ رہی ہے تاکہ وہ اپنی برباد معیشت کی دوبارہ تعمیر کر سکے۔

اس مسئلہ کا واحد حل ایک ایسا نظام ہے جو سود کے خاتمہ اور زکوٰۃ کی اقامت پر مبنی ہو۔ سود کا خاتمہ اس بات کی ضمانت ہے کہ دولت ایک محدود طبقہ میں جمع نہ ہونے پائے۔ اور زکوٰۃ اس بات کی ضمانت ہے کہ دولت کی گردش کسی سماج کے دونوں معاشی ساحلوں پر جاری رہے۔ مگر مسلمانوں کی نادانیوں نے لوگوں کی نظر میں اسلام کو ایک تخریبی نظریہ کی حیثیت دے رکھی ہے۔ آج کی دنیا یہ سوچ نہیں سکتی کہ اسلام کے پاس کوئی ایسا تعمیری نظریہ بھی ہو سکتا ہے جو وہ آج کی دنیا کو دے سکے۔

صفحۂ عبرت

ریاض کے عربی ہفت روزہ الدعوۃ (۲۳ محرم ۱۴۱۳ھ، ۲۳ جولائی ۱۹۹۲ء) میں صفحہ ۱۷ پر ایک خبر کی سرخی یہ ہے: ٤٣ قبيلة تعتنق الاسلام في الفلبين (فلپائن میں ۴۳ قبیلوں کا قبول اسلام)

اس خبر میں بتایا گیا ہے کہ جنوبی فلپائن کے علاقہ مینڈناو (Mindanao) کے ۴۳ بُت پرست قبیلوں نے اپنے اسلام قبول کرنے کا اعلان کیا ہے۔ اسلام قبول کرنے والے ان قبیلوں میں قبیلہ مانوید بھی ہے جو کہ کیدان وان میں رہتا ہے۔ کیدان وان ایک شہر ہے جو صوبہ کوتاباتو (Catabato) میں واقع ہے۔ ان میں ۲۲۰ وہ اشخاص ہیں جنھوں نے پہلے مسیحیت قبول کر لی تھی، مگر اب وہ سب اسلام میں داخل ہو گئے ہیں۔

یہ صرف ایک مہینہ میں پیش آنیوالا واقعہ ہے۔ اس سے پہلے پچھلے سالوں میں بھی وہاں کے لوگ برابر اسلام قبول کرتے رہے ہیں۔ عرب ملکوں میں کام کرنے والے فلپائن کے لوگوں کے بارہ میں اکثر یہ خبریں آتی رہتی ہیں کہ انھوں نے اسلام قبول کر لیا۔

ایک طرف دعوت کے اعتبار سے اسلام کی تسخیر کا یہ عالم ہے۔ دوسری طرف اسی فلپائن کے ایک علاقہ میں پچھلے ۲۰ سال سے "مورو لبریشن فرنٹ" کے نام سے مسلمان سیاسی آزادی کی تحریک چلا رہے ہیں۔ زبردست قربانیوں کے باوجود اب تک اس تحریک کا کوئی بھی مثبت فائدہ حاصل نہ ہو سکا۔ فلپائن کے اس علاقہ میں سات ملین مسلمان رہتے ہیں۔ تعلیم اور اقتصادیات کے اعتبار سے وہ بے حد پیچھے ہیں۔

ستمبر ۱۹۸۹ میں افریقہ کے ایک سفر میں میری ملاقات مورو لبریشن فرنٹ کے چیرمین مسٹر نور مسواری سے ہوئی۔ انھوں نے بتایا کہ اب تک تقریباً ۱۵۰ ہزار مسلمان اس جدوجہد میں اپنی جان دے چکے ہیں۔ اس کے باوجود دور دور تک بھی کہیں کوئی مستقبل نظر نہیں آتا۔ سیاست کے راستہ سے کچھ ملنے والا نہیں، مگر ساری دنیا میں لاکھوں مسلمان اس کے لیے اپنا جان و مال قربان کر رہے ہیں۔ دعوت کے راستہ میں، آج بھی "سرخ اونٹوں" کی دولت مل رہی ہے، مگر کسی کو اس کی راہ میں عمل کرنے کا جذبہ پیدا نہیں ہوتا۔

نیا دور

زمین پوری کائنات میں ایک استثنار ہے۔ یہاں کے وسائل اور یہاں کے امکانات بے پناہ ہیں۔ وہ حسن اور معنویت کی ایک پوری دنیا اپنے اندر لیے ہوئے ہے۔ یہاں وہ سب کچھ اعلیٰ ترین مقدار میں موجود ہے جس کے ذریعہ خوشیوں اور لذتوں کی ایک ابدی تہذیب بنائی جا سکے۔

اس زمین کو سب سے پہلے اس مخلوق کی تحویل میں دیا گیا تھا جس کو جن کہا جاتا ہے۔ مگر وہ اس عطیہ کے اہل ثابت نہ ہو سکے۔ روایات میں آیا ہے:

عَن ابنِ عباس قال اِنّ اولَ مَن سَكَنَ الارضَ الجن فافسدوا فيها وسفكوا فيها الدماء وَقَتَلَ بعضُهم بعضًا — ثُم خَلَقَ اللهُ آدَمَ فاسْكَنَه اياها فلِذٰلكَ قالَ (اِنّی جاعِلٌ فِی الارضِ خَلِيفَة) تفسیر ابن کثیر ۱/۷۰

عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ زمین پر سب سے پہلے جنات بسائے گئے۔ انھوں نے زمین میں فساد برپا کیا اور خون بہایا اور ایک نے دوسرے کو قتل کیا۔ اس کے بعد اللہ نے آدم کو پیدا کیا اور ان کو زمین پر بسایا۔ اسی لیے قرآن میں اللہ تعالےٰ نے فرمایا کہ میں زمین میں ایک خلیفہ بنانے والا ہوں۔

انسانوں میں کچھ افراد اس آباد کاری کے اہل نکلے۔ مگر انسانوں کی اکثریت اس معاملہ میں نااہل ثابت ہوئی۔ موجودہ زمانہ میں یہ نااہلی اپنی آخری حد کو پہنچ گئی ہے۔ آج پوری دنیا انسانوں کے ظلم اور فساد سے بھر گئی ہے۔ ہر طرف لوٹ اور قتل کے ہنگامے جاری ہیں۔

یہ صورت حال اشارہ کر رہی ہے کہ غالباً اب زمین پر وہ آخری تبدیلی آنے والی ہے جس کی بابت بائبل میں یہ الفاظ آئے ہیں: صادق زمین کے وارث ہوں گے اور وہ اس میں ہمیشہ بسے رہیں گے (زبور باب ۳۷) قرآن میں اس کا اعلان ان لفظوں میں کیا گیا ہے: اور زبور میں ہم نصیحت کے بعد لکھ چکے ہیں کہ زمین کے وارث ہمارے نیک بندے ہوں گے۔ بے شک اس میں ایک بڑی خبر ہے عبادت گزار لوگوں کے لیے (الانبیاء ۱۰۵-۱۰۶)

خدا کا یہ آخری فیصلہ اس طرح ظاہر ہوگا کہ تمام برے لوگ کاٹ کر پھینک دیے جائیں گے اور عابد اور صالح افراد ابدی طور پر زمین کے مالک ہوں گے۔

ایک تقابل

ایک تعلیم یافتہ غیر مسلم نے اسلام اور بدھزم کا تقابل کرتے ہوئے کہا کہ اسلام میں اخلاق کی بنیادیں کمزور ہیں۔ جبکہ بدھزم میں انسانی اخلاقیات کو بہت مضبوط بنیاد پر قائم کیا گیا ہے۔ ان کی دلیل یہ تھی کہ اسلام کے پانچ ارکان (ایمان، نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ) صرف عقیدہ اور عبادت سے تعلق رکھتے ہیں۔ جبکہ بدھزم کے پانچ ارکان (پنچ شیل) سب کے سب انسانی اخلاق سے تعلق رکھنے والے اصول ہیں۔ بدھزم کے پانچ ارکان یہ ہیں — قتل نہ کرنا، چوری نہ کرنا، جنسی بے راہ روی نہ کرنا، جھوٹ نہ بولنا، نشہ کی چیز استعمال نہ کرنا:

> The five precepts (panca-sila) for the layman prohibit killing, stealing, engaging in sexual misconduct, lying, and drinking intoxicating liquor. (3/390)

مگر ایسا کہنا درست نہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ بدھزم میں جس طرح اخلاقیات کی تعلیم دی گئی ہے، اسی طرح اسلام میں بھی اخلاق کی تعلیم دی گئی ہے۔ فرق صرف یہ ہے کہ بدھزم اخلاق کی تلقین سماجی سلوک کے طور پر کرتا ہے۔ جبکہ اسلام میں متقیانہ روش کی حیثیت سے اخلاق پر زور دیا گیا ہے۔

اسلام کے پانچوں ارکان میں اخلاق کا تصور بطور تقاضا موجود ہے۔ اسی لئے کہا گیا کہ وہ شخص مومن نہیں جو خود کھائے مگر اس کے قریب کا پڑوسی بھوکا رہے۔ نماز کے لئے قرآن میں ہے کہ نماز آدمی کو فحش اور منکر سے روکتی ہے۔ زکوٰۃ ایک اعتبار سے عبادت ہے اور دوسرے اعتبار سے اپنی چیز میں دوسروں کا حق تسلیم کرنا ہے۔ روزہ کے بارہ میں حدیث میں ہے کہ جو آدمی روزہ رکھ کر جھوٹ بولے اس کا روزہ روزہ نہیں۔ اسی طرح اس آدمی کا حج باطل ہو جاتا ہے جو حج کے رسوم ادا کرے مگر اسی کے ساتھ وہ لڑائی جھگڑے میں ملوث ہو۔

قرآن و حدیث میں کثرت سے اخلاقیات کی تعلیم دی گئی ہے۔ یہاں تک کہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ میں اس لئے بھیجا گیا ہوں تاکہ مکارم اخلاق کی تکمیل کروں (بُعثتُ لاتمم مکارم الاخلاق) اس کو خلاصۂ اسلام بتایا گیا ہے کہ آدمی لوگوں کے درمیان اچھے اخلاق کے ساتھ رہے۔

حقیقت یہ ہے کہ بدھزم میں اخلاق کی حیثیت ایک قسم کی اصلاحی سفارش کی ہے۔ جب کہ اسلام میں اس کا رشتہ خدا کے سامنے جوابدہی سے جڑا ہوا ہے۔ جوابدہی کا یہ پہلو اخلاق کی اہمیت کو بہت زیادہ بڑھا دیتا ہے۔

باب پنجم :

آدابِ دعوت

داعیانہ اخلاق اور دعوتِ اسلام کے تقاضے

مقصدی کردار

۶ ستمبر ۱۹۹۰ء کو ٹیلی فون کی گھنٹی بجی۔ ریسور اٹھایا تو دوسری طرف ایک خاتون انیتا پرتاپ (Anita Pratap) بول رہی تھیں۔ انھوں نے بتایا کہ نئی دہلی میں وہ ٹائم میگزین (نیویارک) کی اسپشل کرسپانڈنٹ ہیں۔ اور مجھ سے "اسلام میں عورت کا مقام" کے مسئلہ پر معلومات حاصل کرنا چاہتی ہیں۔

مقررہ وقت پر وہ دفتر میں آئیں۔ ان کے پاس انگریزی کا ایک ٹائپ کیا ہوا آرٹیکل تھا۔ یہ اسلام میں عورت کی حیثیت کے بارہ میں تھا، اور اس کا عنوان تھا —— پردہ کے پیچھے :

Behind the veil

گفتگو کے دوران انھوں نے بتایا کہ یہ آرٹیکل ہمارے پاس ٹائم کے صدر دفتر نیویارک سے آیا ہے۔ ہمارا میگزین ایک مضمون چھاپنا چاہتا ہے جس میں عورت کے بارہ میں اسلام کی تعلیمات بتائی جائیں گی۔ اس سلسلہ میں سب سے پہلے ہمارے صدر دفتر نے کچھ مسلم ملکوں میں ٹائم کے نمائندوں کو لکھا کہ وہ موضوع سے متعلق ضروری معلومات حاصل کر کے بھیجیں۔ ان معلومات کو سامنے رکھ کر نیویارک کے اڈیٹر نے یہ آرٹیکل تیار کیا۔ اب اس آرٹیکل کو دوبارہ مختلف ملکوں میں ٹائم کے نمائندوں کے پاس بھیجا گیا ہے کہ وہ اپنے یہاں کے مستند علماء سے مل کر اس کے اندراجات کی جانچ کریں اور ان کی تصدیق یا تصحیح کر کے دوبارہ صدر دفتر (نیویارک) کو بھیجیں۔ ہماری ان ترمیمات کو سامنے رکھ کر نیویارک کا ایڈیٹر آرٹیکل کو دوبارہ لکھے گا اور اس کے بعد اُس کو ٹائم میں چھاپا جائے گا۔ انھوں نے کہا کہ اس طرح کی چیزوں میں ہمارا طریقہ "چیک اینڈ ری چیک" کا ہوتا ہے۔

میں نے کہا کہ ایک مضمون کی تیاری میں آپ لوگ اتنا زیادہ محنت کرتے ہیں۔ اس کے جواب میں خاتون کرسپانڈنٹ نے کہا کہ ہمارا میگزین (ٹائم انٹرنیشنل) ساری دنیا میں جاتا ہے اور ہر ملک اور ہر قوم میں پڑھا جاتا ہے۔ ایسی حالت میں ہم اس کا تحمل نہیں کر سکتے کہ ہم اس میں کوئی غلطی کریں :

We can't afford to make any mistakes.

ٹائم کے نمائندہ کا یہ جملہ بے حد سبق آموز ہے۔ ٹائم کا مقصد یہ ہے کہ وہ ساری دنیا میں اپنے پرچہ کے لیے خریدار حاصل کرے۔ اسی لیے اس کا نام ٹائم انٹرنیشنل رکھا گیا ہے۔ اس مقصد کی تکمیل کے لیے

ضروری ہے کہ اس کا ہر شمارہ لوگوں کو غلطیوں سے خالی دکھائی دے۔ اگر لوگ محسوس کریں کہ اس کی رپورٹیں اور اس کی معلومات غلط ہوتی ہیں تو لوگ اس کی خریداری کی طرف مائل نہیں ہوں گے۔ ٹائم اپنے پرچہ کو ساری دنیا میں پھیلانے میں کامیاب نہ ہوسکے گا۔

ٹائم اپنے پرچہ کی غیر مقبولیت کا تحمل نہیں کرسکتا، اس لیے وہ اِس کا تحمل بھی نہیں کرسکتا کہ وہ اپنے صفحات میں ایسی باتیں چھاپے جو غلط یا خلاف واقعہ ہوں۔ اور نتیجۃً لوگوں کو اس سے دور کردینے کا سبب بن جائیں۔

یہی نفسیات زیادہ بڑے پیمانے پر دین کے داعی کی ہوتی ہے۔ داعی کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ وہ خدا کے دین کو خدا کے تمام بندوں کے لیے قابل قبول بنائے۔ اس مقصد کے پیش نظر داعی ہر ممکن تدبیر کے ذریعہ اس کا اہتمام کرتا ہے کہ اس کے اور مدعو کے درمیان ایسی کوئی بات پیش نہ آئے جو مدعو کو دین حق سے بیزار کردے، جس کا نتیجہ اس صورت میں نکلے کہ خدا کا دین مدعو کو مشتبہ دکھائی دینے لگے، وہ مدعو کی نظر میں قابل قبول نہ رہے۔

اس مقصد کے لیے داعی ہر قسم کی "غلطی" سے بچنے کا مکمل اہتمام کرتا ہے۔ وہ مدعو کی پسندیدہ زبان (ابراہیم ۴) میں کلام کرتا ہے۔ وہ دین کو اس کے سامنے قول بلیغ (النساء ۶۳) کے اسلوب میں پیش کرتا ہے۔ وہ مدعو کی زیادتیوں پر یک طرفہ صبر (ابراہیم ۱۲) کرتا ہے۔ وہ تالیف قلب (التوبہ ۶۰) کے ذریعہ اس کے دل کو نرم کرتا ہے۔ وہ اپنے آپ کو تمام اخلاقی کمزوریوں سے پاک (المدثر ۴) کرتا ہے۔ وہ آخری حد تک مدعو کا خیر خواہ (الاعراف ۹) بن جاتا ہے۔ حتی کہ بعض اوقات وہ ایک صحیح اور جائز بات کے سلسلہ میں بھی مدعو کی ضد کو مان لیتا ہے، جیسا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ نے حدیبیہ کے موقع پر مدعو کے اصرار پر لفظ "رسول اللہ" کو کاغذ سے مٹا دیا۔

ٹائم میگزین کے نمائندہ نے کہا کہ ہم غلطیوں کا تحمل نہیں کرسکتے۔ یہی بات ایک داعی کو مزید شدت کے ساتھ کہنا ہے۔ داعی کا احساس یہ ہونا چاہیے کہ میں ایسی کسی بات کا تحمل نہیں کرسکتا جو مدعو کو میرے پیغام سے دور کردے۔ میں یک طرفہ طور پر یہ ذمہ داری لوں گا کہ مدعو کو اپنے پیغام حق کے بارہ میں بدظن نہ ہونے دوں۔ میں ہر اس قول یا فعل سے بچوں گا جو مدعو کے اندر مخالفانہ نفسیات پیدا کرے اور میری بات کو اس کے لیے ناقابل قبول بنا دے۔

دعوت الی اللہ

ایک ہندستانی عالم سعودی عرب گئے۔ وہ ایک دینی جماعت کے سربراہ ہیں۔ وہاں انھوں نے ایک انٹرویو دیا جو ریاض کے عربی ہفت روزہ الدعوۃ کے شمارہ ۱۹ ذی القعدہ ۱۴۱۲ھ (۲۱ مئی ۱۹۹۲ء) میں شائع ہوا ہے۔ اس کا ایک سوال یہ ہے:

س۔ ماھی الانشطۃ التی تقوم بھا جمعیتکم فی مجال الدعوۃ الی اللہ؟

ج۔ من ابرز انشطۃ جمعیتنا فی مجال الدعوۃ الاسلامیۃ تنظیم المحاضرات والندوات والمؤتمرات الاسلامیۃ لمناقشۃ وضع المسلمین فی الھند۔

الدعوۃ کے نمائندہ (فہد البکران) نے سوال کیا کہ وہ کون سی سرگرمیاں ہیں جو آپ کی جماعت دعوت الی اللہ کے میدان میں انجام دے رہی ہے۔ ہندستانی عالم نے جواب میں کہا کہ دعوت اسلامی کے میدان میں ہماری جماعت کی سرگرمیوں میں سب سے زیادہ نمایاں سرگرمی ہندستان میں مسلمانوں کی حالت کے بارہ میں لکچروں اور سیناروں اور کانفرنسوں کا انعقاد ہے۔

یہی موجودہ زمانہ کے علما اور دانشوروں کا عام ذہن ہے۔ وہ مسلمانوں کے مسائل پر تقریر وتحریر کی سرگرمیاں دکھاتے ہیں اور اس کو دعوت الی اللہ کا کام سمجھتے ہیں۔ حالانکہ اس طرح کے کسی کام کا دعوت الی اللہ سے کوئی تعلق نہیں۔

مسلمانوں کی اصلاح یا مسلمانوں کے مسائل کے حل کے لئے کوشش کرنا بذات خود ایک مطلوب کام ہے۔ مگر اس کا صحیح نام اصلاح المسلمین ہے نہ کہ دعوت الی اللہ۔ دعوت الی اللہ اسلام میں اس کام کا عنوان ہے جو غیر مسلمین میں اللہ کا پیغام پہنچانے کے لئے انجام دیا جاتا ہے۔

دعوت الی اللہ ایک بے حد نازک ذمہ داری ہے جو غیر مسلموں کے تئیں اہل اسلام کے اوپر مقرر کی گئی ہے۔ یہ کام سرتاپا صبر، خیرخواہی، حکمت اور موعظت حسنہ کے جذبہ کے تحت انجام دیا جاتا ہے۔ اس میں مدعو کی زیادتیوں کو یک طرفہ طور پر برداشت کیا جاتا ہے۔ داعی کسی بھی حال میں مدعو سے کوئی قومی یا مادی نزاع نہیں چھیڑتا۔ یہ وہ کام ہے جس میں ضروری ہوتا ہے کہ داعی فریق ثانی کی اشتعال انگیزی پر مشتعل نہ ہو۔ وہ برائی کا بدلہ بھلائی سے دے اور تعصب اور ظلم کے باوجود مدعو کے حق میں دعا کرتا رہے۔

داعی اور مدعو

مسلمان کی حیثیت موجودہ دنیا میں کیا ہے۔ قرآن کے مطابق، مسلمان کی حیثیت یہ ہے کہ وہ دنیا کی قوموں کے اوپر اللہ کے دین کے گواہ ہیں (لتکونوا شہداء علی الناس) اہل اسلام کی حیثیت کے بارہ میں یہی بات حدیث میں ان الفاظ میں آئی ہے کہ: المؤمنون شُہَدَاءُ اللهِ فِی الارضِ (فتح الباری بشرح صحیح البخاری ۵/۲۹۹) دوسری روایت میں یہ الفاظ ہیں کہ: انتم شہداء اللہ فی الارض (فتح الباری ۳/۲۷۰)

گواہی یا شہادت سے مراد وہی چیز ہے جس کے لئے دوسرے مقام پر دعوت الی اللہ یا تبلیغ ما انزل اللہ کے الفاظ آئے ہیں۔ شہادت کا لفظ اس عمل کے اخروی پہلو کو بتا رہا ہے۔ جو لوگ دنیا میں کسی قوم کے اوپر دعوت و تبلیغ کا کام اس کی تمام شرطوں کے ساتھ انجام دیں گے، ان کو مزید یہ اعزاز حاصل ہوگا کہ قیامت میں جب اس قوم کے ابدی انجام کا فیصلہ ہوگا تو وہاں وہ ان کے سامنے خدائی گواہ کے طور پر کھڑے کئے جائیں گے۔

مسلمان کی اس حیثیت کا تقاضا ہے کہ ان کے اندر داعی والا کردار ہو۔ وہ دوسری قوموں کو مدعو کے روپ میں دیکھیں۔ مسلمان اور دوسری قوموں کے درمیان داعی اور مدعو کا رشتہ ہے نہ کہ قومی حریف اور سیاسی رقیب کا رشتہ۔

قومیں آپس میں مادی اور سیاسی مفاد کے لئے رسہ کشی کرتی ہیں۔ مگر مسلمان کے لئے اس قسم کا قومی سلوک کسی بھی حال میں جائز نہیں۔ مسلمان کو اس دنیا میں ایک بامقصد اور ایک صاحب نظریہ گروہ کی حیثیت سے رہنا ہے۔ اس کا مزاج دوسری قوموں سے لینے کا نہیں بلکہ دوسری قوموں کو دینے کا ہونا چاہئے۔ مسلمان پر لازم ہے کہ وہ دوسروں کی طرف سے پیش آنے والی شکایتوں اور زیادتیوں کو برداشت کرے۔ وہ تمام لوگوں کے ساتھ یکطرفہ حسن سلوک کا معاملہ کرے۔ اس کی ساری توجہ پیغام رسانی پر ہو نہ کہ حقوق طلبی پر۔ وہ دنیا میں خیر خواہِ اقوام بن کر رہے۔ وہ دنیا کے لوگوں کو مادرِ مہربان کی نظر سے دیکھے۔ وہ اپنے لئے جینے کے بجائے دوسروں کے لئے جینے لگے۔

قانون فطرت

۱۵ جنوری ۱۹۹۶ء کو سہارن پور (امبیٹھہ) کے ڈاکٹر شاہد صابری سے ملاقات ہوئی۔ (Tel. 013292-5229) انھوں نے حکیم انور صاحب کے حوالے سے ایک واقعہ بتایا۔ حکیم انور صاحب کا مطب امبیٹھہ میں ہے۔ ان کا تعلق گنگوہ سے بھی ہے اور وہ اکثر وہاں جاتے رہتے ہیں۔

۱۹۹۱ء کا واقعہ ہے جب کہ اتر پردیش میں رتھ یاترا کی دھوم تھی۔ حکیم انور صاحب گنگوہ کی ایک سڑک سے گزر رہے تھے۔ اس سڑک کے کنارے ایک صوفی کا مزار ہے جو باپڑی والے پیر کے نام سے مشہور ہیں۔ اسی وقت ایک مقامی ہندو لالہ اشوک بھاردواج (نکروڑی روڈ، گنگوہ) وہاں سے گزرے۔ مزار کے پاس پہنچ کر وہ رکے۔ اپنے روایتی طریقہ کے مطابق، انھوں نے اپنے دونوں ہاتھ جوڑ لیے اور دیر تک ادب و احترام کے ساتھ مزار کے سامنے کھڑے رہے۔

لالہ اشوک بھاردواج کا تعلق آر ایس ایس سے ہے۔ حکیم انور صاحب کو یہ منظر دیکھ کر تعجب ہوا۔ آگے بڑھ کر انھوں نے ان سے کہا کہ لالہ جی، عام مسلمانوں کے تو آپ دشمن ہیں۔ مگر اس قبر والے کے سامنے آپ ہاتھ جوڑ رہے ہیں، حالاں کہ وہ بھی مسلمان تھے۔ لالہ اشوک بھاردواج نے جواب دیا: آپ بھی اس قبر والے مسلمان جیسے بن جائیے، ہم آپ کے لیے بھی ہاتھ جوڑنے لگیں گے۔

ہندوؤں کا یہ احترام صرف گنگوہ کے مدفون بزرگ کے لیے نہیں ہے بلکہ تمام ہندستانی صوفیوں کے لیے ہے جس کا نمونہ جگہ جگہ ان کے مزاروں پر دیکھا جا سکتا ہے۔ اب غور کیجئے کہ صوفیوں اور موجودہ مسلمانوں میں وہ کون سا خاص فرق ہے کہ ہندو موجودہ مسلمانوں سے بیزار ہے اور عین اسی وقت وہ مسلم صوفیوں سے محبت کرتا ہے۔ اس کا بنیادی سبب صرف ایک ہے —— ان مسلم صوفیوں نے ہندو کے مقابلہ میں کبھی کوئی احتجاج یا مطالبہ نہیں کیا۔ جب کہ موجودہ مسلمان پچھلے پچاس سال سے اپنے نااہل لیڈروں کی رہ نمائی میں ہندوؤں سے احتجاج اور مطالبہ کی مہم جاری کیے ہوئے ہیں۔

بے نیازی اور قناعت کرنے والے کے آگے لوگ جھکتے ہیں اور شکایت اور مطالبہ کرنے والوں سے لوگ بیزار ہو جاتے ہیں۔ یہ فطرت کا قانون ہے، اور فطرت کے قانون میں کوئی استثنا نہیں۔

بددعا نہیں

قال الامام احمد حدثنا ابوالنضر حدثنا ابوعقیل حدثنا عمرو بن حمزة عن سالم عن ابیہ قال سمعت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یقول : اللّٰھم العن فلانا وفلانا ، اللّٰھم العن الحارث بن ھشام اللّٰھم العن سھیل بن عمرو اللّٰھم العن صفوان بن امیة۔ فنزلت الآیة (لیس لک من الامر شیٔ او یتوب علیھم او یعذبھم فانھم ظالمون) فتیب علیھم کلھم۔ وقال احمد حدثنا ابومعاویة الغلابی حدثنا خالد بن الحارث حدثنا محمد بن عجلان عن نافع عن عبد اللہ ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کان یدعو علی اربعة فانزل اللہ (لیس لک من الامر شیٔ) قال وھداھم اللہ للاسلام (تفسیر ابن کثیر، الجزء الاول، صفحہ ۴۰۲)

ترجمہ : امام احمد نے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم (مدینہ میں) یہ کہتے تھے کہ اے اللہ، فلاں اور فلاں پر لعنت کر، اے اللہ حارث بن ہشام پر لعنت کر، اے اللہ، سہیل بن عمرو پر لعنت کر، اے اللہ، صفوان بن امیہ پر لعنت کر، تو قرآن میں یہ آیت اتری کہ تم کو اس معاملہ میں کوئی اختیار نہیں۔ اللہ یا ان کو توبہ کی توفیق دے گا یا ان کو عذاب دے گا، کیوں کہ وہ ظالم ہیں (آل عمران ۱۲۸) پھر ان سب کو توبہ کی توفیق ملی (اور وہ ایمان لائے) امام احمد نے ایک اور روایت اس طرح نقل کی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم (مشرکوں میں سے) چار آدمیوں کے خلاف بددعا کرتے تھے تو اللہ نے یہ آیت اتاری کہ تم کو اس معاملہ میں کوئی اختیار نہیں۔ راوی کہتے ہیں کہ اللہ نے ان چاروں آدمیوں کو اسلام کے ذریعہ ہدایت دی۔

اس حدیث میں جن کافروں اور مشرکوں کا ذکر ہے، انھوں نے خود قرآن کے بیان کے مطابق "ظلم" کا ارتکاب کیا تھا۔ ان کی برائی اتنی واضح تھی کہ خود پیغمبر اسلام کی زبان سے ان کے خلاف لعنت اور بددعا کے کلمات نکلنے لگے۔ اس کے باوجود نہ صرف ایسا ہوا کہ ان کے خلاف لعنت اور بددعا سے روک دیا گیا بلکہ ان سب کے اندر آخرکار نیا ذہن ابھرا، اور ان سب نے اسلام قبول کر لیا۔

داعی کا طریقہ

اخرج احمد عن رجل من بنی مالک بن کنانة قال: رأیتُ رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم بسوق ذی المجاز یتخلّلھا یقول: یا ایّھا الناس قولوا لا اِلٰہ الا اللّٰہ تفلحوا۔ قال وابوجھل یحثی علیہ التراب ویقول لا یُغوینّکم ھذا عن دینکم فانّما یرید لتترکوا اٰلھتکم وتترکوا اللّات والعزّیٰ۔ وما یلتفت الیہ رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلّم (۱/ ۱۰۸)

امام احمد نے نقل کیا ہے کہ بنو مالک بن کنانہ کے ایک شخص نے کہا کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کو میں نے (ہجرت سے پہلے) ذوالمجاز کے بازار میں دیکھا تھا۔ آپ ان کے درمیان چل رہے تھے اور یہ کہہ رہے تھے کہ اے لوگو، کہو کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں، تم فلاح پاؤ گے۔ راوی کہتے ہیں کہ ابوجہل بھی آپ کے ساتھ تھا۔ وہ آپ پر مٹی پھینک رہا تھا اور یہ کہتا جاتا تھا کہ لوگو، یہ شخص تم کو تمہارے دین سے بہکا نہ دے۔ وہ چاہتا ہے کہ تم لوگ اپنے معبودوں کو چھوڑ دو اور لات اور عزّیٰ کو ترک کر دو۔ مگر میں نے دیکھا کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم ابوجہل کی طرف کوئی توجہ نہیں فرما رہے ہیں۔

رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے اس واقعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ داعی کا طریقہ کیا ہے۔ جب ایک شخص لوگوں کو اللہ کے سچے دین کی طرف بلانے کے لیے اٹھتا ہے تو وہ لوگ اس کے دشمن بن جاتے ہیں جو جھوٹے دین پر کھڑے ہوئے تھے۔ وہ اس کا مذاق اڑاتے ہیں۔ طرح طرح سے اس کو تکلیف پہنچاتے ہیں۔ مگر داعی پر لازم ہے کہ وہ ان کی طرف التفات نہ کرے۔ وہ ان کی ایذا رسانی سے اعراض کرتے ہوئے اپنا دعوتی کام جاری رکھے۔

ابوجہل کی شرانگیزی کے مقابلہ میں رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کا مذکورہ رویہ نعوذ باللہ بزدلی کی بنا پر نہ تھا۔ بلکہ وہ عین بہادری تھا۔ اسی بہادرانہ کردار کا نام صبر و اعراض ہے۔ صبر و اعراض دعوت کی لازمی قیمت ہے۔ جو شخص صبر و اعراض کا ثبوت نہ دے، وہ دعوتِ حق کا کام بھی انجام نہیں دے سکتا۔

ایک سنّت

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی میں جو جنگی مقابلے پیش آئے ان میں سے ایک جنگ احد (۳ ھ) ہے۔ اس جنگ میں ابتداءً اہل اسلام کو فتح ہوئی۔ مگر عین اس وقت کچھ مسلمانوں کی غلطی سے رخ بدل گیا اور مسلمان وقتی شکست سے دوچار ہوئے۔ اس سلسلہ کا ایک واقعہ یہ ہے :

فأصيب سبعون قتيلاً واشرف ابو سفيان فقال۔ افی القوم محمد۔ فقال لا تجيبوه - فقال افی القوم ابن ابی قحافة۔ فقال لا تجيبوه۔ فقال افی القوم ابن الخطاب فقال لا تجيبوه۔ فقال : ان هولاء قتلوا۔ فلو كانوا احياء لأجابوا

(البدایہ والنہایہ ۴/۲۵)

پس مسلمانوں میں سے ستر آدمی مارے گئے۔ اور مشرکین کے سردار ابو سفیان نے بلندی سے پکار کر کہا۔ کیا قوم کے اندر محمدؐ ہیں۔ آپ نے فرمایا کہ اسے جواب نہ دو۔ کہنے والے نے پھر کہا۔ کیا قوم کے اندر ابن ابی قحافہ ہیں۔ آپ نے فرمایا کہ اسے جواب نہ دو۔ کہنے والے نے پھر کہا۔ کیا قوم کے اندر ابن خطاب ہیں۔ آپ نے فرمایا کہ اسے جواب نہ دو۔ اس کے بعد کہنے والے نے کہا : کہ یہ لوگ مارے گئے۔ اگر وہ زندہ ہوتے تو ضرور جواب دیتے۔

جنگ احد کے بعد فریق ثانی کی طرف سے اشتعال انگیز باتیں کہی گئیں۔ مگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اہل اسلام کو ہدایت فرمائی کہ تم لوگ جوابی انداز اختیار نہ کرو، بلکہ خاموش رہو۔ اس سے معلوم ہوا کہ اس طرح کے مواقع پر مسلمانوں کا طرز عمل کیا ہونا چاہیے۔

اس سنتِ رسول سے معلوم ہوتا ہے کہ اس طرح کے ہیجانی مواقع پر اہل اسلام کو ردعمل کا طریقہ اختیار نہیں کرنا چاہیے۔ انھیں چاہیے کہ وہ اشتعال انگیزی کے باوجود مشتعل نہ ہوں۔ وہ نعرہ کا جواب نعرہ سے نہ دیں۔ اس کے بجائے وہ ایسا کریں کہ یک طرفہ طور پر خاموشی اختیار کر لیں۔ اگر وہ اللہ کی خاطر چپ ہو جائیں گے تو اللہ کے فرشتے ان کی طرف سے جواب دیں گے۔ اور جن لوگوں کی طرف سے اللہ کے فرشتے جواب دیں، ان کو زیر کرنا یقیناً کسی کے بس کی بات نہیں۔

غصہ نہ کرو

قرآن میں اہل ایمان کی صفت یہ بتائی گئی ہے کہ وہ اپنے غصہ کو اندر ہی اندر پی جاتے ہیں (آل عمران ۱۳۴) اور جن لوگوں کے اوپر انھیں غصہ آیا ہے ان کو معاف کر دیتے ہیں (الشوریٰ ۳۷) اس بات کو حدیث میں مختلف انداز سے بتایا گیا ہے۔ ایک روایت یہ ہے :

عن حُمید بن عبد الرحمٰن عن رجل من اصحاب النبی صلی اللہ علیہ وسلم قال۔ قال رجل یا رسول اللہ اوصنی، قال : لاتغضب۔ قال الرجل۔ ففکرت حین قال النبی صلی اللہ علیہ وسلم ما قال۔ فاذا الغضب یجمع الشر کلہ (مسند احمد)

حمید بن عبد الرحمٰن تابعی کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اصحاب میں سے ایک صحابی نے انھیں بتایا کہ ایک شخص نے کہا کہ اے خدا کے رسول، مجھے نصیحت کیجئے۔ آپ نے فرمایا کہ غصہ نہ کرو۔ صحابی کہتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اس نصیحت پر غور کیا تو میں نے جانا کہ غصہ تمام برائیوں کا مجموعہ ہے۔

انسان کی فطرت خیر پسند ہوتی ہے۔ یہ فطرت ہر انسان کو برائی سے روکتی ہے۔ وہ برائی کے خلاف ایک مستقل چیک ہے۔ یہی وجہ ہے کہ کوئی انسان کبھی نارمل حالت میں برائی نہیں کر پاتا۔ کوئی شخص برائی صرف اس وقت کرتا ہے جب کہ کوئی غیر معمولی واقعہ پیش آئے جو اس کی فطری حالت کو درہم و برہم کر دے۔

یہ غیر معمولی حالت ہمیشہ انا کے بھڑکنے سے پیدا ہوتی ہے۔ کسی آدمی کی انا جب بھڑکتی ہے تو اس وقت وہ فطرت کے قبضہ سے نکل کر غصہ کے قبضہ میں چلا جاتا ہے۔ اور پھر وہ ایسے کام کر ڈالتا ہے جو عام حالات میں وہ کبھی نہیں کر سکتا تھا۔

انسانوں کی یہ تقسیم صحیح نہیں ہے کہ ان میں کچھ خیر پسند ہیں اور کچھ شر پسند۔ زیادہ صحیح تقسیم یہ ہوگی کہ مشتعل انسان اور غیر مشتعل انسان کا لفظ بولا جائے۔ مشتعل ہونے سے پہلے ہر انسان خیر پسند ہی ہوتا ہے۔ البتہ مشتعل ہونے کے بعد وہ شر پسند بن جاتا ہے۔

غصہ پر کنٹرول کرنا تمام بھلائیوں کا سرچشمہ ہے اور غصہ کو بھڑکانا تمام برائیوں کا سرچشمہ۔

بددعا نہیں

لیس لک من الامر شئ او یتوب علیہم او یعذبہم فانہم ظالمون۔ وللہ ما فی السماوات وما فی الارض یغفر لمن یشاء ویعذب من یشاء واللہ غفور رحیم (آل عمران ۱۲۹-۱۲۸)

تم کو کچھ اختیار نہیں۔ اللہ یا ان کو توبہ کی توفیق دے یا ان کو عذاب دے، کیوں کہ وہ ظالم ہیں۔ اور اللہ ہی کا ہے جو کچھ آسمانوں میں ہے اور جو کچھ زمین میں ہے۔ وہ جس کو چاہے بخش دے اور جس کو چاہے عذاب دے، اور اللہ بخشنے والا مہربان ہے۔

احادیث سے ثابت ہے کہ مدینہ میں رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے کچھ کافروں اور مشرکوں پر لعنت کی اور ان کے خلاف بددعا کی۔ اس پر یہ آیتیں اتریں۔ اس آیت میں ان کافروں اور مشرکوں کو صاف طور پر "ظالم" کہا گیا ہے۔ مگر ظالم ہونے کے باوجود پیغمبر اسلام صلے اللہ علیہ وسلم کو یہ اجازت نہیں دی گئی کہ آپ ان پر لعنت بھیجیں اور ان کے خلاف بددعا فرمائیں۔

ابن کثیر نے اپنی تفسیر میں اس آیت کے تحت مختلف روایتیں جمع کی ہیں۔ ان کے مطالعہ سے آیت کا مفہوم پوری طرح واضح ہو جاتا ہے۔ یہاں ہم کچھ روایتوں کو مختصر طور پر نقل کرتے ہیں۔

امام بخاری نے نقل کیا ہے کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نماز فجر کی دوسری رکعت میں جب رکوع سے سر اٹھاتے تو سمع اللہ لمن حمدہ کہنے کے بعد یہ کہتے: اللّٰھم العن فلانا وفلانا (خدایا فلاں اور فلاں پر لعنت کر) اس پر اللہ تعالیٰ نے مذکورہ آیت نازل فرمائی (اور لعنت سے منع کر دیا) امام احمد نے اپنی مسند میں نقل کیا ہے کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم یہ کہتے تھے کہ اے اللہ، حارث بن ہشام، سہیل بن عمرو، صفوان بن امیہ پر لعنت کر، اس پر مذکورہ آیت اتری (اور آپ کو لعنت سے منع کر دیا گیا)

امام بخاری نے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم مشرکین میں سے کچھ لوگوں کا نام لے کر ان کے خلاف بددعا کرتے تھے۔ یہاں تک اللہ تعالیٰ نے مذکورہ آیت اتاری (تو آپ نے بددعا چھوڑ دی)

امام بخاری نے ایک اور روایت میں نقل کیا ہے کہ غزوۂ احد کے دن رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم زخمی ہو گئے تو آپ نے کہا کہ وہ قوم کیسے فلاح پائے گی جو اپنے نبی کو زخمی کرے۔ اس وقت مذکورہ آیت اتری

(اور آپ اپنے قول سے باز آگیے) امام احمد نے روایت کیا ہے کہ غزوۂ احد کے دن رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے سامنے کے دانت ٹوٹ گیے اور آپ کا چہرہ زخمی ہوگیا۔ یہاں تک کہ آپ کے چہرہ پر خون بہہ پڑا۔ آپ نے کہا کہ وہ قوم کیسے فلاح پائے گی۔ جس نے اپنے نبی کے ساتھ ایسا کیا، حالاں کہ وہ ان کو ان کے رب کی طرف بلا رہا تھا۔ اس وقت مذکورہ آیت اتری (اس کے بعد آپ رک گیے) تفسیر ابن کثیر، الجزا الاول، صفحہ ۴۰۳ - ۴۰۲

سورۂ آل عمران کی مذکورہ آیت اور اس کی تشریحی روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ مخالفین اسلام کے کھلے ہوئے ظلم کے باوجود ان پر لعنت کرنا یا ان کے خلاف بد دعا کرنا جائز نہیں۔ جارحیت کی صورت میں بشرط استطاعت ان سے دفاع کیا جائے گا، مگر عین اس وقت بھی ان کے خلاف بد دعا نہیں کی جائے گی جب کہ وہ میدانِ جنگ میں اترے ہوئے ہوں، حتیٰ کہ اس وقت بھی نہیں جب کہ انھوں نے پیغمبر خدا کو زخمی کر دیا ہو۔

اسی کا نام داعیانہ اخلاق ہے۔ داعی کو ہر حال میں صبر کا حکم دیا گیا ہے۔ داعی کے لیے جائز نہیں کہ وہ اپنے مدعو سے نفرت کرنے لگے۔ مدعو اگر زیادتی کرے تب بھی حکم ہے کہ داعی اس کو برداشت کرے۔ وہ دعاگوئی کی حد تک اس کا خیر خواہ بن جائے۔

داعی کی یہ روش اس کی دعوت کو طاقت ور بناتی ہے۔ وہ اس کے دعوتی عمل کو تسخیری عمل کے درجہ تک پہنچا دیتی ہے۔

بصیرت کی اہمیت

آپ صحیح البخاری کھولیں تو اس کی پہلی حدیث وہ ملے گی جس کو عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ نے منبر پر بیان کیا تھا۔ اس کا پہلا فقرہ ہے: إِنَّمَا الْأَعْمَالُ بِالنِّيَّاتِ (بے شک عمل کا دار ومدار نیت پر ہے)

پھر اسی صحیح البخاری میں، مثال کے طور پر، کتابُ الوضوء، بابُ البول قائماً وقاعداً کے تحت ایک روایت یہ ہے کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم ایک گروہ کے کوڑا خانہ پر گیے۔ پھر آپ نے کھڑے ہو کر پیشاب کیا (اتی النبیُّ صلی اللہ علیہ وسلم سُبَاطَةَ قَوْمٍ فَبَالَ قَائِماً)

اب ایک شخص ہے جو پہلی حدیث کو لے کر اس پر تقریر کرتا ہے اور لوگوں سے کہتا ہے کہ خالص اللہ کے لیے عمل کرو، اگر تم اللہ کی رضا کے سوا کسی اور چیز کو مقصود بناؤ گے تو تمہارا سارا عمل اکارت ہو جائے گا۔ آخرت میں اسی عمل کی قیمت ہے جو خالص اللہ کی خوشنودی کے لیے کیا گیا ہو۔

دوسرا شخص وہ ہے جو صرف دوسری حدیث کو لے لیتا ہے۔ وہ لوگوں کے اندر اس بات کی مہم چلاتا ہے کہ لوگ کھڑے ہو کر پیشاب کریں۔ کیوں کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے ایسا کیا ہے۔

بظاہر یہ دونوں آدمی حدیث پر عمل کر رہے ہیں۔ مگر اس ظاہری مشابہت کے باوجود پہلا آدمی صحیح ہے اور دوسرا آدمی غلط۔ کیوں کہ پہلا آدمی ایک ایسی تعلیم کی اشاعت کر رہا ہے جو عمومی حیثیت رکھتی ہے۔ اس تعلیم کی جتنی بھی اشاعت کی جائے اس سے دین میں کوئی نقص واقع نہ ہوگا۔ مگر دوسرے آدمی کا معاملہ اس سے مختلف ہے۔ وہ ایک اتفاقی واقعہ کو کلی اور عمومی حیثیت دے رہا ہے۔ ایسا شخص فتنہ کا داعی ہے نہ کہ دین کا داعی۔

اس مثال سے اندازہ ہوتا ہے کہ دین کا کام کرنے کے لیے صرف دینی معلومات کافی نہیں، اسی کے ساتھ دینی بصیرت بھی انتہائی طور پر ضروری ہے۔ اسی لیے کہا گیا ہے کہ ایک من علم کے لیے دس من عقل کی ضرورت ہوتی ہے (یک من علم را دہ من عقل می باید)

دینی علم کو دینی بصیرت بنانے کا راز تقویٰ ہے۔ جو آدمی تقویٰ اور خشیت والا ہوگا اس کا علم اپنے آپ بصیرت کی صورت میں ڈھل جائے گا۔

یہ فرق کیوں

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم نے قدیم مکہ میں لوگوں کو حق کا پیغام دینا شروع کیا تو لوگوں کی طرف سے نہایت سخت ردعمل ظاہر کیا گیا۔ اس وقت آپ کو یک طرفہ طور پر صبر و اعراض کا حکم دیا گیا۔ چنانچہ مکہ کے ۱۳ سال تک آپ نے مکمل طور پر اس خدائی ہدایت پر عمل فرمایا۔ آپ ہر قسم کی قولی اور عملی تکلیفوں کو برداشت کرتے ہوئے انھیں اپنی پیغمبرانہ دعوت پہنچاتے رہے۔

دوسری طرف خود پیغمبر اسلام کے حالات بتاتے ہیں کہ آپ نے ان اسلاف پر سخت تنقیدیں کیں جن کو عرب کے لوگ اپنا مقتدا اور اپنا مذہبی رہنما سمجھتے تھے۔ مشرکین کو اس پر بہت بگڑتے تھے۔ ان کے سردار جب آپ کے چچا ابو طالب کے پاس جمع ہوئے تو ان سرداروں نے ان سے آپ کی جو شکایت کی وہ یہ تھی :

فقالوا یا اباطالِبْ، اِنَّ ابنَ اَخِیکَ	انھوں نے کہا کہ اے ابو طالب، آپ کے بھتیجے نے ہمارے
قَدْ سَبَّ آلِهتَنا وَعَابَ دِينَنا	معبودوں کو گالی دی اور ہمارے دین کو عیب لگایا
وَسَفَّهَ اَحْلامَنا وَضَلَّلَ آباءنا	اور ہماری عقلوں کو بیوقوف بتایا اور ہمارے قومی
(سیرۃ ابن ہشام ۱/۲۰۰)	اکابر کو گمراہ ٹھہرایا۔

سیرت رسول کا یہ واقعہ بتاتا ہے کہ دو باتیں ایک دوسرے سے بالکل الگ ہیں۔ ایک ہے مدعو کی زیادتی اور اشتعال انگیزی کا معاملہ۔ اس معاملہ میں داعی کو صبر اور اعراض کا حکم دیا گیا ہے۔ داعی کو یک طرفہ طور پر مدعو کی زیادتیوں پر صبر کرنا ہے۔ داعی کے لیے کسی حال میں جائز نہیں کہ وہ مدعو کے مقابلہ میں ردعمل کا انداز اختیار کرے۔

دوسرا معاملہ ان اکابر قوم کا ہے جو مدعو گروہ کے مقتدا اور رہنما بنے ہوئے ہوں۔ جن سے عام لوگ فکری رہنمائی حاصل کرتے ہوں۔ اس دوسرے معاملہ میں داعی کو صبر کے بجائے احتساب کا طریقہ اختیار کرنا ہے۔ اس کو ان فکری رہنماؤں کی رہنمائی پر واضح تنقید کرنا ہے تاکہ حق کا حق ہونا اور باطل کا باطل ہونا پوری طرح واضح ہو جائے۔ داعی کو یہ تنقیدی کام بہر حال کرنا ہے خواہ مدعو کو وہ اتنا زیادہ برا معلوم ہو کہ وہ داعی کے بارے میں یہ کہنے لگے کہ تم ہمارے اکابر کو گالی دیتے ہو، تم ہمارے بڑوں کا سب و شتم کر رہے ہو۔

دو منٹ کی بات

لندن کی ایک ٹی وی کمپنی انسائٹ ٹیلی وژن (Insight Television) کی ٹیم ۱۰ مارچ ۱۹۹۳ کو اسلامی مرکز میں آئی۔ انھوں نے کہا کہ ہم ۱۲ منٹ کا ایک ویڈیو پروگرام ریکارڈ کر رہے ہیں۔ اس میں چھ آدمی دو دو منٹ کے لیے بولیں گے۔ یہ پروگرام ساری دنیا میں دکھایا جائے گا۔ ہر آدمی سے ایک سوال کیا جائے گا اور وہ صرف دو منٹ میں اس کا جواب دے گا۔ سوال یہ تھا :

We are today a deeply divided society. To what principle of life should we turn, Hindus and Muslims and others, so that we can live in harmony?

میں نے کہا کہ اس کا جواب بالکل سادہ ہے۔ ایک بچہ آپ سے پوچھے کہ مجھ کو گلاب کا پھول لینا ہے۔ لیکن گلاب کے پیڑ میں کانٹے بھی ہیں۔ پھر میں کیا کروں۔ آپ کہیں گے کہ تم کانٹے سے بچو اور اس کے پھول کو لے لو۔ یہی معاملہ انسان کا بھی ہے۔ انسان کے اندر بھی کانٹا اور پھول دونوں ہے۔ ایگو اس کا کانٹا ہے اور کانشنس اس کا پھول ہے۔ آپ انسان سے معاملہ کرتے ہوئے ایسا کریں کہ اس کے ایگو کو نہ چھیڑیں۔ آپ ہمیشہ اس کے کانشنس کو ٹچ کریں۔ اس کے بعد سماج میں ہر طرف ہارمنی ہی ہارمنی دکھائی دے گی۔

ہر آدمی کے اندر فطری طور پر دو فیکلٹی ہوتی ہے —— ایگو اور کانشنس۔ ایگو نفرت کا سورس ہے اور کانشنس محبت کا سورس۔ مگر دونوں ہی سوئی ہوئی حالت میں ہیں۔ یہ آپ کے اوپر ہے کہ آپ دونوں میں سے کس کو جگائیں۔ اگر آپ نے ایگو کو جگایا تو آپ کو اس سے نفرت اور دشمنی ملے گی۔ اور اگر آپ نے کانشنس کو جگایا تو محبت اور دوستی آپ کے حصہ میں آئے گی۔

مدھیہ پردیش کے ایک ٹاؤن میں ہندوؤں کا جلوس نکلا۔ وہ چلتا ہوا مسلم ایریا میں آیا۔ یہاں مسجد کے امام سے جلوس والوں کی تکرار ہوگئی۔ کچھ مسلم نوجوانوں نے جلوس پر پتھر پھینکے اور پھر فرقہ وارانہ فساد ہوگیا۔ بعد کو امام صاحب کی سمجھ میں آیا کہ فساد کا سبب یہ تھا کہ جلوس پر پتھر پھینک کر جلوس والوں کے ایگو کو بھڑکا دیا گیا۔ انھوں نے طے کیا کہ اب جلوس نکلا تو وہ ان کے کانشنس کو جگائیں گے۔

اگلے سال پھر اسی طرح ہندوؤں کا جلوس نکلا۔ جب وہ چلتا ہوا مسجد کے سامنے پہنچا تو امام صاحب پیشگی منصوبہ کے تحت پھولوں کا ہار لے کر باہر آئے۔ انھوں نے جلوس کے ہندو لیڈر سے کہا : ہم آپ کا سواگت کرتے ہیں۔ یہ کہہ کر انھوں نے پھولوں کا ہار لیڈر کے گلے میں ڈال دیا۔

جیسے ہی امام صاحب نے ایسا کیا لیڈر کی گردن انسانیت کے اعتراف میں جھک گئی۔ اس نے دونوں ہاتھ جوڑ کر امام صاحب کو پرنام کیا۔ اس نے کہا کہ امام صاحب، مسلمانوں کے پتھر مجھ کو نہیں جھکا سکے تھے، مگر آپ کے پھولوں نے مجھ کو جھکا دیا۔ اب تک میں آپ کو دشمن کے روپ میں دیکھتا تھا۔ مگر آج سے آپ میرے دوست ہیں۔ اور یہ دوستی اب کبھی ٹوٹنے والی نہیں۔

دونوں میں فرق کا سبب یہ ہے کہ مسلمانوں کا پچھلا رویہ لیڈر کے ایگو کو جگانے والا تھا۔ امام صاحب کے موجودہ رویہ نے لیڈر کے کانشنس کو جگا دیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ پچھلے سال جہاں ہندوؤں اور مسلمانوں نے ایک دوسرے کو مارا تھا، وہیں دونوں ایک دوسرے سے گلے ملنے لگے۔ کل کے دشمن آج کے بھائی بھائی بن گئے۔

دونوں واقعہ میں فرق کیا ہے۔ وہ فرق یہ ہے کہ بستی کے مسلمانوں نے اس سے پہلے جلوس والوں کی انا کو بھڑکایا تھا۔ اب انھوں نے جلوس والوں کے ضمیر کو جگا دیا۔ انا نفرت کا سرچشمہ ہے اور ضمیر محبت کا سرچشمہ۔ انا سے آگ اور دھواں نکلتا ہے اور ضمیر سے خوشبو اور ٹھنڈک۔ انا انسانیت کو توڑنے والی ہے اور ضمیر انسانیت کو جوڑنے والی۔

عام طور پر لوگ انسانوں کو اچھے اور برے کے خانے میں بانٹتے ہیں، وہ کچھ افراد کو دوست سمجھ لیتے ہیں اور کچھ اور افراد کو دشمن۔ مگر یہ تقسیم مصنوعی ہے۔ اپنی ابتدائی فطرت کے اعتبار سے تمام انسان صرف انسان ہیں۔ وہ اپنی اصل فطرت کے لحاظ سے ایک دوسرے کے لیے بے ضرر ہیں۔ ہر انسان اپنے ذاتی مفاد میں اتنا مشغول ہے کہ اس کو دوسرے کے ساتھ دشمنی کرنے کی فرصت نہیں۔

اس کے باوجود دشمنی کیوں پیدا ہوتی ہے۔ دشمنی ایک استثنائی حالت ہے نہ کہ عام اور معتدل حالت۔ دشمنی ہمیشہ اس وقت پیدا ہوتی ہے جب کہ قول یا عمل سے کسی کے غصہ کو بھڑکا دیا جائے۔ اگر آپ آدمی کے اندر سوئے ہوئے غصہ کو نہ بھڑکائیں تو آپ اس کے نقصان سے بھی لازمی طور پر بچے رہیں گے۔

ناقابل معافی

حدیث میں آیا ہے کہ ایک لڑائی میں ایک مسلمان کے سر پر زخم آگیا۔ وہ زخمی حالت میں تھا کہ اگلی صبح کو اسے غسل کی حاجت ہوئی۔ پانی سر پر ڈالنا سخت مہلک تھا۔ اس نے دوسرے مسلمان ساتھیوں سے مسئلہ پوچھا۔ انھوں نے کہا کہ پانی کی موجودگی میں ہم تیرے لئے کوئی گنجائش نہیں پاتے۔

مسلمان نے جب دیکھا کہ دوسری کوئی راہ نہیں ہے تو اسی حالت میں اس نے غسل کرلیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اس کی حالت نازک ہوگئی اور وہ مرگیا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو جب اس واقعہ کی خبر ہوئی تو آپ کو بے حد دکھ ہوا۔ آپ نے فرمایا: قتلوہ قتلھم اللہ (انھوں نے اس کو ہلاک کرڈالا۔ خدا انھیں ہلاک کرے)

مذکورہ مسئلہ واضح طور پر اجتہادی تھا۔ اس کے باوجود آپ نے ان کے بارہ میں اتنے سخت الفاظ فرمائے۔ اس سے معلوم ہوا کہ اجتہاد میں غلطی کی معافی کی بھی ایک حد ہے۔ عام حالات میں اجتہادی خطا پر پکڑ نہیں ہے۔ مگر جب معاملہ زیادہ نازک ہو جب ایسا مسئلہ درپیش ہو جس سے آدمی کی زندگی اور موت وابستہ ہوجائے تو ایسی حالت میں اجتہادی رائے پیش کرنے سے بچنا چاہئے۔ ایسے موقع پر اجتہادی رائے دینا اور اس پر اصرار کرنا بے حسی کی بات ہے اور بے حسی ایمان کی موت کی نشانی ہوتی ہے۔

اوپر کی حدیث صرف ایک ایسی اجتہادی غلطی سے متعلق ہے جس کا نقصان انفرادی سطح پر ظاہر ہوا ہو۔ پھر یہی بات مزید شدت کے ساتھ ان واقعات کے بارہ میں صادق آتی ہے جب کہ کوئی قائد ملت کو ایسی اجتہادی رائے پر دوڑا دے جس کا نتیجہ ملت کے لئے اجتماعی ہلاکت کی صورت میں برآمد ہوا ہو۔

"غسل کے وقت آدمی کا رخ قبلہ کی طرف ہو یا نہ ہو" اس مسئلہ میں مفتی اگر غلط فتویٰ دیدے تو اس میں کسی کے لئے جان ومال کے نقصان کا اندیشہ نہیں۔ مگر ایک شخص جو شدید طور پر زخمی ہے وہ غسل کرے یا نہ کرے، اس معاملہ میں غلط فتویٰ سے آدمی کی جان خطرہ میں پڑجاتی ہے۔ اس لئے دونوں قسم کے مسائل پر غلطی کا معاملہ یکساں نہیں ہے۔ پہلی قسم کا مسئلہ وہ مسئلہ ہے جس میں اجتہادی غلطی پر بھی آدمی کو حسن نیت کا ثواب مل سکتا ہے۔ مگر دوسری قسم کے مسئلہ میں اجتہادی غلطی کرنا ناقابل معافی جرم ہے۔ نازک معاملات جن کے ساتھ فرد اور قوم کی قسمتیں ہوں، ان میں مفتی کے لئے لازم ہے کہ وہ آخر وقت تک چپ رہے۔ اور اگر بولے تو اس وقت بولے جب کہ فی الواقع وہ خدا کے سامنے اس کے لئے بری الذمہ ہوچکا ہو۔

ردِّ عمل

سعید نورسی (۱۸۷۳-۱۹۶۰ء) ترکی کے ایک عالم اور مجاہد تھے۔ وہ بے حد ذہین اور قابل آدمی تھے۔ ترک حکومت کے خلاف ان کے پرجوش بیانات کی وجہ سے حکومت ان کی مخالف ہوگئی۔ وہ گرفتار کر لیے گیے۔ وہ فوجی عدالت کے سامنے پیش کیے گیے۔ وہاں انھوں نے بیان دیتے ہوئے کہا:

لو ان لی الف روح لما ترددت ان اجعلها فداء لحقیقة واحدة من حقائق الاسلام۔

اگر میرے پاس ایک ہزار روح ہوتی تب بھی میں اس سے نہ ہچکچاتا کہ ان سب کو اسلام کی حقیقتوں میں سے کسی ایک حقیقت کے لیے قربان کر دوں۔

(دعوۃ الحق، رباط، نومبر ۱۹۸۵، صفحہ ۸۰)

سعید نورسی تعلیم اور مطالعہ میں مشغول تھے کہ ایک واقعہ گزرا جس نے ان کی زندگی کو مجاہدانہ زندگی بنا دیا:

وفی هذه الاثناء قرأ بدیع الزمان فی الجرائد المحلیة ان وزیر المستعمرات البریطانی غلادستون صرح فی مجلس العموم البریطانی وهو یخاطب النواب و بیده نسخة من القرآن الکریم قائلاً: مادام هذا القرآن بید المسلمین فلن نستطیع ان نحکمهم۔ لذلك فلا مناص لنا من أن نزیله من الوجود او نقطع صلة المسلمین به۔

(۱۸۹۴ کے دوران) بدیع الزمان سعید النورسی نے بعض مقامی اخبارات میں پڑھا کہ برطانیہ کے وزیر نوآبادیات گلیڈسٹون نے برطانی دارالعوام میں تقریر کی۔ ان کے ہاتھ میں قرآن تھا اور انھوں نے نمائندگان کو مخاطب کرتے ہوئے کہا کہ جب تک یہ قرآن مسلمانوں کے ہاتھ میں رہے گا ہم ان کے اوپر اپنا حکم نہیں چلا سکتے۔ اس بنا پر ہمارے لیے اس کے سوا کوئی صورت نہیں کہ یا تو اس کتاب کا وجود مٹا دیں یا مسلمانوں کا رشتہ اس سے کاٹ دیں۔

(صفحہ ۷۸)

سعید نورسی کے اندر یہ تڑپ نہیں اٹھی کہ وہ "گلیڈاسٹون" کو گمراہی سے نکالیں اور

اس کو جنت کا راستہ دکھانے کی کوشش کریں۔ البتہ اس نے سعید نورسی کی مقدس کتاب کی توہین کر دی تو وہ بھڑک اٹھے۔ یہی موجودہ زمانہ میں تمام مسلم شخصیتوں کا حال رہا ہے۔ مثبت مقصد کے لیے وہ نہ اٹھ سکے۔ البتہ ردعمل کے جذبہ کے تحت وہ کبھی ایک کے خلاف جھنڈا لے کر کھڑے ہو گیے اور کبھی دوسرے کے خلاف۔

اسلام مثبت حقیقتوں کا دین ہے۔ وہ ردعمل کے تحت بھڑک اٹھنے کا نام نہیں۔ مومن وہ ہے جو خدا کی عظمتوں کو دریافت کرے اور اس میں جینے والا بن جائے۔ وہ کائنات میں خدا کی نشانیوں کو پڑھے اور اس کے ذہن میں ربانی علوم کا چشمہ پھوٹ نکلے۔ وہ غیب کے پردہ کو پھاڑ کر جنت اور جہنم کو دیکھ لے اور پھر شدید ترین طور پر اس بات کا حریص بن جائے کہ خدا اس کو جہنم کی آگ سے بچائے اور اس کو جنت کے باغوں میں داخل کرے۔

اسی معرفت کا نام ایمان و اسلام ہے۔ اور یہ ایمان و اسلام اپنی آخری انتہا پر پہونچ کر دعوت بن جاتا ہے۔

سعید نورسی نے پرجوش طور پر کہا تھا کہ اسلام کی باتوں میں سے کسی ایک بات کا مسئلہ بھی ہو تو وہ اس کے لیے اپنا پورا وجود صرف کرنے کے لیے تیار ہیں۔ بظاہر ان کے یہ الفاظ تمام اسلام کو سمیٹے ہوئے ہیں۔ لیکن گہرائی کے ساتھ دیکھئے تو اس کا تعلق صرف جزئی اسلام سے ہے نہ کہ کلی اسلام سے۔

ایک غیر مسلم شخص کا قرآن کے خلاف گستاخی کرنا اسلام کے مسائل میں سے ایک مسئلہ ہے اسی طرح اسلام کا ایک اور مسئلہ یہ ہے کہ اس غیر مسلم کو اور اس کے جیسے دوسرے غیر مسلموں کو اسلام کی دعوت پہونچائی جائے۔ سعید نورسی اور ان کے جیسے دوسرے لوگ اول الذکر اسلامی مسئلہ کے لیے تو بہت تڑپے۔ مگر ثانی الذکر اسلامی مسئلہ کے لیے ان میں سے کسی کے اندر تڑپ پیدا نہیں ہوئی۔ یہی موجودہ زمانہ کے تمام مسلم مجاہدین کا معاملہ ہے۔ وہ دوسروں سے نفرت کرنے کے مجاہد بنے، مگر وہ دوسروں سے محبت کرنے کے مجاہد نہ بن سکے۔ لوگوں کو جہنم میں داخل کرنے کے لیے انھوں نے بہت سرگرمی دکھائی، مگر وہ اس کے لیے سرگرم نہ ہو سکے کہ لوگوں کو خدا کی رحمتوں کے سایہ میں پہونچائیں۔

کمی یہاں ہے

نیتاجی سبھاش چندر بوس نے ۱۹۴۳ میں آزاد ہند فوج (Indian National Army) بنائی تھی۔ اس کا مقصد انگریزوں سے لڑکر ہندستان کو آزاد کرانا تھا۔ یہ فوج رنگون میں بنائی گئی۔ مگر قبل اس کے کہ وہ ہندستان میں داخل ہو انگریزی فوج کے برمی دستہ نے اسے ختم کر دیا۔

آزاد ہند فوج کے تین خاص کمانڈر تھے۔ ڈھلوں، سہگل اور شاہ نواز۔ ان لوگوں پر لال قلعہ کی ایک عدالت میں غداری کا مقدمہ چلایا گیا جس کی وکالت مدّعیٰ علیہ کی طرف سے جواہر لال نہرو نے کی تھی۔ اسی زمانہ میں ایک شاعر کا یہ شعر بہت مشہور ہوا تھا:

لال قلعہ سے آئی آواز ڈھلوں، سہگل، شاہ نواز

کرنل گوربخش سنگھ ڈھلوں (عمر ۷۵ سال) اب شیوپوری (مدھیہ پردیش) میں رہتے ہیں۔ اور کبھی کبھی دہلی آتے ہیں۔ پرمیلا کلہن نے ان سے ایک انٹرویو لیا جو ہندستان ٹائمس (۱۹ مئی ۱۹۸۸) میں چھپا ہے۔ اس انٹرویو میں انھوں نے جو باتیں بتائیں ان میں سے ایک بات مطبوعہ انٹرویو کے مطابق یہ تھی کہ ہندستانیوں اور ایشیائیوں نے فیاضانہ طور پر نیتاجی سبھاش چندر بوس کی مالی مدد کی۔ رنگون کے ایک مسلمان تاجر نے تنہا ان کو ایک کرور روپیہ دیا:

A cosmetic manufacturer, a Muslim in Rangoon, gave a crore of rupees (p.10).

۱۹۴۴ کا ایک کرور روپیہ آج کے لحاظ سے ۵۰ کرور روپیہ سے بھی زیادہ ہے۔ موجودہ زمانہ میں مسلمانوں نے سیاسی اور قومی کاموں میں بہت بڑا بڑا تعاون دیا ہے۔ اور بے شمار سرمایہ خرچ کیا ہے۔ مگر دور جدید کی پوری تاریخ میں کوئی ایک مثال نہیں جب کہ مسلمانوں نے دعوت الی اللہ کے کام میں کوئی بڑا تعاون کیا ہو۔ دوسرے لفظوں میں یہ کہ وہ نفرتِ اقوام کے لیے اٹھے مگر وہ محبتِ اقوام کے لیے نہ اٹھ سکے۔ یہی واحد سب سے بڑا سبب ہے جس نے موجودہ زمانہ میں مسلمانوں کے سارے معاملات کو برباد کر رکھا ہے۔ جب تک وہ اپنے اس مزاج کو نہ بدلیں، کسی بھی دوسری تدبیر سے ان کے حالات بدلنے والے نہیں۔

نفرت، محبّت

روایات میں آتا ہے کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم مدینہ کی مسجد نبوی میں بیٹھے ہوئے تھے۔ آپ کے اصحاب بھی وہاں موجود تھے۔ اتنے میں ایک اعرابی (دیہاتی گنوار) وہاں آیا۔ وہ مسجد کے اندر ایک جگہ کھڑا ہو کر پیشاب کرنے لگا۔ صحابہ اس کو پکڑنے اور مارنے کے لیے دوڑے۔ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے منع کیا کہ اسے چھوڑ دو۔ جب اعرابی پیشاب کر چکا تو آپ نے صحابہ سے کہا کہ ایک بالٹی پانی لاؤ اور جہاں اس نے پیشاب کیا ہے وہاں پانی بہا کر اس کو صاف کر دو۔ اس کے بعد آپ نے اعرابی کو بلایا اور نرمی کے ساتھ اس سے کہا کہ دیکھو یہ مسجد ہے۔ یہاں خدا کا ذکر اور عبادت کی جاتی ہے۔ یہ بول و براز کرنے کی جگہ نہیں۔

اعرابی پر اس واقعہ کا بہت اثر ہوا۔ ابتدا میں اگر اس کا گنوار پن جاگا ہوا تھا تو اب اس کا ضمیر جاگ اٹھا۔ وہ اسی حالت میں اپنے قبیلہ میں واپس گیا۔ وہاں وہ دیوانہ وار لوگوں سے کہتا پھرتا تھا کہ دیکھو، میں مدینہ گیا۔ وہاں میں نے یہ گندا کام کیا کہ محمد کی مسجد میں پیشاب کر دیا۔ مگر انھوں نے صرف یہ کیا کہ جہاں میں نے گندا کیا تھا اس کو پانی سے دھو دیا۔ خدا کی قسم محمد نے نہ مجھ کو جھڑکا اور نہ وہ میرے اوپر غصہ ہوئے (واللہ ما زجرنی محمد، واللہ ما قهرنی محمد) اعرابی کا یہ کہنا اس کے قبیلہ والوں کے لیے اسلام کی تبلیغ بن گیا۔ چنانچہ پورا کا پورا قبیلہ اسلام کے دین میں داخل ہو گیا۔ جس قبیلہ کے ایک آدمی نے مسجد میں آکر پیشاب کر دیا تھا، اسی قبیلہ کے تمام آدمی دوبارہ مسجد میں اس لیے آئے کہ مسجد کا احترام کریں اور اس میں ایک خدا کے آگے سجدہ کر کے اپنی اطاعت و فرماں برداری کا اظہار کریں۔

یہ دور رسالت کا واقعہ ہے۔ اب موجودہ زمانہ کے مسلمانوں کو دیکھئے۔ ۱۸۳۱ میں سید احمد شہید بریلوی کو زبانی طور پر یہ خبر ملی کہ پنجاب کے مہاراجہ رنجیت سنگھ نے پنجاب کی کچھ مسجدوں کو اصطبل بنا دیا ہے۔ وہاں اس کے گھوڑے بندھے ہوئے ہیں۔ اس خبر کے بعد انھیں کسی مزید تحقیق کی ضرورت نہ تھی۔ وہ بہت سے مسلمانوں کو لے کر پنجاب پہونچے اور رنجیت سنگھ کی فوجوں سے لڑ گئے۔ اس لڑائی میں ہزاروں مسلمان مارے گئے۔ ایک تذکرہ نگار کے الفاظ میں، پنجاب کی زمین مسلمانوں کے

خون سے لالہ زار ہو گئی۔

۱۸۵۷ کے غدر (یا جنگ آزادی) میں یہ واقعہ ہوا کہ مسلمان اس بات پر بھڑک اٹھے کہ انھیں وقت کے حکمرانوں کی طرف سے ایسے کارتوس دیئے گیے ہیں جن میں خنزیر کی چربی لگی ہوئی ہے۔ یا کچھ انگریز سپاہی اپنے گھوڑوں پر چڑھ کر کسی مسجد کے اندر داخل ہو گیے ہیں۔ اس کے نتیجہ میں مسلمانوں نے انگریزوں سے جو لڑائی لڑی، اس میں لاکھوں مسلمان مارے گیے۔ بے شمار مسلمانوں کا خون بہا۔ مگر سب کچھ لاحاصل، کیوں کہ جو صورت حال تھی، وہ بدستور مزید شدت کے ساتھ برقرار رہی۔

اس وقت سے لے کر اب تک لڑائی بھڑائی کا یہ سلسلہ جاری ہے۔ مسلمان ہر طرف اپنا خون بہا رہے ہیں۔ غیر قوم کا کوئی شخص مسجد کی دیوار پر رنگ ڈال دے۔ کوئی مسجد کے سامنے غلط نعرے لگا دے۔ کوئی جلوس باجا بجاتا ہوا مسجد کی سڑک سے گزر جائے۔ اس طرح کا کوئی واقعہ ہو تو مسلمان مشتعل ہو کر لڑ جاتے ہیں۔ اس کے بعد مسلمانوں اور غیر مسلمانوں کے درمیان فساد ہوتا ہے گولیاں چلتی ہیں۔ بے شمار لوگ مارے جاتے ہیں۔ اس طرح کے جھگڑے اور لڑائیوں میں مسلمانوں کا جو خون بہتا ہے وہ اتنا زیادہ ہے کہ اس کو ناپنے کے لیے بالٹی کی نہیں بلکہ ڈرم کی ضرورت ہوگی۔ مسلمانوں کے اپنے بیان کے مطابق سڑکوں پر مسلمانوں کا خون بہہ رہا ہے۔ بستیاں مسلمانوں کے خون سے سرخ ہو رہی ہیں۔

اب دیکھیے کہ یہ سارا خون جو بہایا جا رہا ہے اس کا فائدہ کیا ہے۔ کیا اس کی وجہ سے خدا کے بندے خدا کے دین میں داخل ہو رہے ہیں۔ کیا اس کی وجہ سے اسلام کے دشمن اسلام کے دوست بن رہے ہیں۔ کیا اس کی وجہ سے ایسا ہو رہا ہے کہ قومیں اور قبیلے اسلام میں داخل ہو کر اسلام کی طاقت بن جائیں۔

ظاہر ہے کہ ایسا نہیں ہے۔ مسلمانوں کے خون کا سیلاب ایک سو سال سے بھی زیادہ مدت سے بہہ رہا ہے۔ مگر کوئی بھی شخص نہیں جس کی روح کو خون کے اس دریا نے پاک کیا ہو۔ کوئی ایک آدمی نہیں جو اس خون کی وجہ سے مسلمانوں کے دین میں داخل ہوا ہو۔ کوئی ایک قبیلہ نہیں جس نے مسلمانوں کے اس عمل کو دیکھ کر ایسا کیا ہو کہ وہ خدا کی نافرمانی کو چھوڑ کر خدا کا مومن و مسلم بن جائے

یہ فرق کیوں ہے۔ دور رسالت میں پانی نے جو نتیجہ دکھایا تھا، بعد کے دور میں خون بھی وہ نتیجہ

نہ دکھا سکا۔ اس فرق کی وجہ یہ ہے کہ رسول کا پانی محبت کا پانی تھا۔ اور موجودہ مسلمانوں کا خون نفرت کا خون ہے۔ رسول نے انسان کے اوپر معافی، خیر خواہی، شفقت اور مہربانی کی بارش برسائی تھی۔ اس کے برعکس آج کے مسلمانوں کا حال یہ ہے کہ وہ انسان کے اوپر نفرت اور غصہ اور اشتعال کا خون انڈیل رہے ہیں۔ یہی وہ فرق ہے جس نے دورِ اول کے عمل کا یہ نتیجہ پیدا کیا تھا کہ قومیں کی قومیں اور قبیلے کے قبیلے اسلام کے سایہ میں داخل ہو گئے۔ اسلام ساری دنیا کا سب سے زیادہ طاقتور اور سب سے زیادہ غالب دین بن گیا۔ اور موجودہ زمانہ میں اسلام ساری دنیا میں حقیر ہو رہا ہے، وہ ایک بلین مسلمانوں کے باوجود ساری دنیا میں کمزور اور مغلوب مذہب بنا ہوا ہے۔

ہر آدمی کے اندر پیدائشی طور پر دو مختلف صلاحیتیں ہیں۔ ایک نفس لوّامہ (ضمیر) اور دوسرے، نفسِ امّارہ (انانیت)۔ یہ دونوں صلاحیتیں ابتدائی طور پر سوئی ہوئی حالت میں ہوتی ہیں۔ اب اگر آپ فریقِ ثانی کے نفسِ لوّامہ کو جگائیں تو اس کی شخصیت کا انسانی جزء آپ کے حصہ میں آئے گا۔ اور اگر آپ فریقِ ثانی کے نفسِ امارہ کو جگائیں تو اس کی شخصیت کا حیوانی جزء آپ کے حصہ میں آئے گا۔

رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی کوشش ہمیشہ یہ ہوتی تھی کہ آپ آدمی کے وجود کے انسانی حصّہ کو جگائیں۔ اس لیے آپ نہ صرف اچھوں کے ساتھ اچھا سلوک کرتے تھے بلکہ بروں کے ساتھ بھی آپ ہمیشہ اچھا سلوک کرتے تھے۔ اس کی وجہ سے آدمی کی چھپی ہوئی فطرت جاگتی تھی۔ اور آخر کار وہ اسلام قبول کر کے آپ کا ساتھی بن جاتا تھا۔

موجودہ مسلمان رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی اس سنت پر عمل نہیں کرتے کہ بروں کے ساتھ بھی اچھا سلوک کرو۔ وہ ہمیشہ ردِّ عمل کا طریقہ اختیار کرتے ہیں۔ چنانچہ ان کا طریقہ صرف فریقِ ثانی کی انانیت کو جگانے کا باعث بنتا ہے۔ خدا کے بندوں کے لیے ان کے پاس "محبت کا پانی" نہیں، البتہ ان کے پاس "نفرت کا خون" کافی مقدار میں موجود ہے۔ جس کو وہ لوگوں کے اوپر انڈیلتے رہتے ہیں۔

ایسے لوگوں کو خدا کے اس باغ میں صرف کانٹے ملیں گے۔ وہ اس باغ کے پھولوں کے مالک نہیں بن سکتے۔ یہی قانونِ قدرت کا فیصلہ ہے۔

تشخص کا مسئلہ

مولانا عبدالمتین بنارسی (مقیم دہلی) نے ۱۰ نومبر ۱۹۸۹ کی ملاقات میں ایک واقعہ بتایا۔ وہ دہلی سے بنارس کے لیے سفر کر رہے تھے۔ ٹرین میں ان کی ملاقات ایک ہندو مسافر سے ہوئی۔ گفتگو کے دوران انھوں نے مذکورہ ہندو سے پوچھا کہ دسہرہ کیا ہے۔ ہندو نے فوراً جواب دیا: جیسے آپ کے یہاں تعزیہ ہے ویسے ہی ہمارے یہاں دسہرہ ہے۔

ایک اور مسلمان بزرگ نے بتایا کہ انھوں نے ایک ہندو لیڈر کی تقریر سنی۔ لیڈر نے تقریر کے دوران کہا کہ مجھے تو مسلمان اور ہندو کا کوئی فرق نہیں معلوم۔ بس اتنا ہے کہ مسلمان لٹا کر پوجتے ہیں اور ہندو کھڑا کر پوجتے ہیں (یعنی مسلمان قبر کے مردہ کو پوجتے ہیں اور ہندو مندر کی مورتی کو)

ایک بار ایک شہر میں عید میلاد النبی کا جشن تھا۔ روایتی انداز میں لمبا جلوس نکالا گیا۔ ایک ہندو نے اس کو دیکھ کر کہا: آخر ہندوؤں اور مسلمانوں میں کیا فرق ہے۔ ہندوؤں کے یہاں اگر رام لیلا ہے تو مسلمانوں کے یہاں محمد لیلا۔

ایک مسجد میں روزانہ فجر کی نماز کے بعد لاؤڈ اسپیکر پر "درود وسلام" پڑھا جاتا تھا، نعت خوانی ہوتی تھی۔ پڑوس کے ایک ہندو نے چند روز اس کو سننے کے بعد کہا: ہندوؤں اور مسلمانوں کا مذہب تو مجھ کو ایک ہی دکھائی دیتا ہے۔ بس یہ فرق ہے کہ ہندوؤں کے یہاں جو کچھ ہوتا ہے اس کا نام کیرتن ہے، اور مسلمانوں کے یہاں جو کچھ ہوتا ہے اس کا نام انھوں نے درود وسلام رکھا ہے۔

اس طرح کے بے شمار واقعات ہیں جو بتاتے ہیں کہ موجودہ مسلمانوں نے اپنے دین میں اتنی بدعات اور تحریفات کی ہیں کہ اب دوسرے مذہب والوں کی نظر میں اسلام اور غیر اسلام کا فرق ہی مٹ گیا ہے۔ اسلامی تشخص کا سب سے بڑا مسئلہ بلاشبہ یہی ہے۔ نام نہاد مسلم رہنما شور کرتے ہیں کہ غیر مسلم قومیں ہمارے اسلامی تشخص کو مٹانا چاہتی ہیں۔ مگر اسلامی تشخص کو مٹانے کا جو واقعہ خود مسلمان انجام دے رہے ہیں، اس کے خلاف وہ کچھ نہیں بولتے۔ شاید اس لیے کہ دوسری قوم کے خلاف بولنا سب سے زیادہ آسان کام ہے اور اپنی قوم کے خلاف بولنا سب سے زیادہ مشکل کام۔

اسلوب دعوت کا مسئلہ

رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے ہجرت سے پہلے اپنی پیغمبرانہ زندگی کے تقریباً تیرہ سال مکہ میں گزارے۔ یہ آپ کی زندگی کا خالص دعوتی مرحلہ تھا۔ اس ابتدائی مرحلہ کی تفصیل بتاتے ہوئے ابن اسحاق کہتے ہیں :

فلما بادی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قومہ بالاسلام وصدع بہ کما امرہ اللہ لم یبعد منہ قومہ ولم یردوا علیہ، حتی ذکر آلھتھم وعابھا۔ فلما فعل ذلک اعظموہ وناکروہ و اجمعوا خلافہ وعداوتہ

(سیرۃ ابن ہشام، الجزء الاول، صفحہ ۲۷۵-۲۷۶)

رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے جب اپنی قوم کے سامنے اسلام کا اظہار کیا اور کھلم کھلا اس کا اعلان فرمایا جیسا کہ اللہ نے آپ کو حکم دیا تھا، تو آپ کی قوم نے آپ سے دوری اختیار نہ کی اور نہ آپ کا رد کیا۔ یہاں تک کہ آپ نے ان کے معبودوں کا ذکر کیا اور ان پر عیب لگایا۔ تو جب آپ نے ایسا کیا تو انھوں نے آپ کو اہمیت دی اور اس کا انکار کیا اور آپ کی مخالفت اور دشمنی پر متحد ہو گئے۔

اس بیان میں " عیب " سے مراد وہی چیز ہے جس کو آج کل تنقید کہا جاتا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے ابتدائی (تین سال) تک سادہ اور غیر تنقیدی انداز میں قریش کے سامنے اپنی بات رکھی۔ اس کے بعد آپ نے تنقیدی انداز اختیار فرمایا۔ ابتدائی مرحلہ میں آپ کے مخاطبین نے کوئی برہمی ظاہر نہیں کی۔ مگر جب آپ نے ان کے معبودوں (بالفاظ دیگر، اکابر قوم) پر تنقید کی تو وہ سخت برہم اور مشتعل ہو گئے۔

رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم اگر مستقل طور پر غیر تنقیدی انداز میں کلام کرتے رہتے اور قرآن میں بھی تنقیدی آیتیں نہ اترتیں تو عرب کے لوگ وہ مخالفت اور دشمنی اختیار نہ کرتے جو انھوں نے بعد کو اختیار کی۔ اس کے باوجود کیوں ایسا ہوا کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم اس قسم کی تمام مصلحتوں کو نظر انداز کرتے ہوئے اپنے تنقیدی اسلوب پر قائم رہے۔

اس کی وجہ یہ ہے کہ غیر تنقیدی نوعیت کا روحانی اور اخلاقی انداز ذاتی مقبولیت یا عوامی بھیڑ جمع کرنے کے لیے تو بہت کار آمد ہے، مگر وہ اصل مقصد کے لیے کار آمد نہیں۔ غیر تنقیدی انداز لوگوں کو سننے میں بہت اچھا لگتا ہے، مگر وہ ذہنوں میں ہلچل پیدا نہیں کرتا۔ اس سے وہ فکری انقلاب نہیں آتا، جب کہ آدمی کی سوچنے کی صلاحیت جاگتی ہے۔ اس پر ایک چیز کا غلط ہونا منکشف ہوتا ہے اور دوسری چیز کے صحیح ہونے کو وہ شعوری طور پر دریافت کرتا ہے۔ اسلام کو وہ افراد مطلوب ہیں جو انقلابی (کرانتکاری) ذہن رکھتے ہوں، اور تنقیدی اندازِ دعوت کے بغیر ایسے افراد کا بننا ہرگز ممکن نہیں۔

غیر تنقیدی اسلوب غیر فطری اسلوب ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ صحیح بھی صحیح ہے اور غلط بھی صحیح۔ یہی وجہ ہے کہ جو تحریک غیر تنقیدی انداز میں چلائی جائے، اس سے مصنوعی شخصیت پیدا ہوتی ہے، اس کے ذریعہ کبھی مطلوب اسلامی شخصیت پیدا نہیں کی جا سکتی۔

رات کے وقت تالاب میں شبنم گرتی ہے۔ مگر اس سے تالاب کے پانی میں کوئی تموّج پیدا نہیں ہوتا۔ لیکن اسی تالاب میں ایک بڑا پتھر پھینک دیجیے تو اس سے ٹھہرے ہوئے پانی میں زبردست تموج پیدا ہو جائے گا۔ اس مثال سے تنقیدی اور غیر تنقیدی اسلوب کے فرق کو سمجھا جا سکتا ہے۔ غیر تنقیدی اسلوب شبنم کی مانند ہے۔ اس سے آدمی کو ایک روحانی سکون تو ملتا ہے مگر اس سے اس کے سینہ میں اضطراب پیدا نہیں ہوتا۔

مگر یہ مطلوب اسلامی شخصیت نہیں۔ حدیث میں بتایا گیا ہے کہ ایمان امید اور خوف کے درمیان ہے (الایمان بین الرجاء والخوف) مومن کو ایک طرف امید ہوتی ہے کہ خدا رحیم و کریم ہے، وہ اس کو بخش دے گا۔ دوسری طرف اس کو اندیشہ ہوتا ہے کہ خدا عادل ہے، وہ اس سے حساب لے گا، اور جس کا حساب لیا گیا وہ ہلاک ہوا (من نوقش فقد هلك) اس بنا پر مومن ہمیشہ "فغطی فغطی" کے درمیان ہوتا ہے۔ یہ چیز اس کو ایک پر اضطراب شخصیت بنا دیتی ہے۔ چنانچہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم اور تمام اصحاب رسول ہمیشہ اضطراب کی نفسیات میں رہتے تھے۔ ان میں سے کوئی شخص بھی پر سکون شخصیت کا حامل نہ تھا۔

ایمان موجودہ دنیا میں درد ہے اور آخرت میں راحت۔

جنگ بے فائدہ

نپولین ۲۳ سال تک یورپی ملکوں سے جنگ لڑتا رہا۔ آخر کار انگلینڈ کے ڈیوک (Duke of Wellington) نے ۱۸ جون ۱۸۱۵ کو واٹرلو جنگ (Battle of Waterloo) میں نپولین بوناپارٹ کو شکست دی (X/570) ڈیوک کی یہ فتح اتنی عظیم تھی کہ اس کو "گریٹ ڈیوک" کہا جانے لگا۔ اس کی بابت لکھا گیا کہ واٹرلو کے مقام پر نپولین کو شکست دینے کے بعد وہ دنیا کے فاتح کو فتح کرنے والا بن گیا:

By defeating Napoleon at Waterloo he became the conqueror of the world's conqueror. (19/755)

ہر طرف ڈیوک کی تعریف کی جانے لگی۔ مگر خود ڈیوک جھوٹے فخر (false pride) کا شکار نہیں ہوا۔ اس کو اس بات کا شدید احساس تھا کہ اس فتح تک پہنچنے کے لئے اس کے اپنے ملک سمیت چار ملک تباہ ہو گئے ہیں۔ اس نے کہا کہ کوئی بھی چیز، ایک ہاری ہوئی جنگ کے سوا، ایک جیتی ہوئی جنگ کی غم ناکی کی آدھی غم ناک بھی نہیں ہو سکتی:

Nothing except a battle lost can be half so melancholy as a battle won.

یہی ہر جنگ کا معاملہ ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ جنگ میں ہار جیت کے درمیان اتنا ہی فرق ہے کہ ہار کے ساتھ شرمندگی شامل ہوتی ہے، اور جیت کے ساتھ شرمندگی شامل نہیں ہوتی۔ ورنہ بربادی کے اعتبار سے جیت اور ہار دونوں تقریباً یکساں ہیں۔

دوسری عالمی جنگ میں برطانیہ فاتح بن کر نکلا۔ مگر اس کے نتیجہ میں وہ اتنا کمزور ہو گیا کہ اس کے اندر یہ طاقت نہیں رہی کہ وہ اپنے زیر قبضہ ملکوں پر اپنا کنٹرول قائم رکھ سکے۔ خلیج کی جنگ میں امریکہ نے بظاہر شاندار فتح حاصل کی۔ مگر مسلسل ایسی رپورٹیں اخباروں میں آرہی ہیں جن سے اندازہ ہوتا ہے کہ امریکہ کے لوگ نتیجۂ جنگ کے معاملہ میں مایوسی کا شکار ہو رہے ہیں۔

ہندستان ٹائمس (۸ جون ۱۹۹۱) میں اس کے نمائندہ مقیم واشنگٹن، مسٹر این سی منن کی رپورٹ

چھپی ہے۔ اس میں وہ بتاتے ہیں کہ امریکہ کے لوگ جنگ کے نتائج پر مطمئن نہیں۔ وہ لوگ کہہ رہے ہیں کہ امریکہ نے آخر خلیج کی جنگ سے کیا حاصل کیا:

Just what did the United States gain from the war?

جب کسی سے اختلاف اور ٹکراؤ کی حالت پیش آتی ہے تو اس کا پر امن حل بھی وہیں موجود ہوتا ہے۔ مگر آدمی اکثر اوقات پر امن حل کو چھوڑ کر جنگ کے حل کی طرف دوڑتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ محسوس کرتا ہے کہ پر امن حل میں وہ اپنی کچھ چیزوں کو کھو رہا ہے۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ پر امن حل میں بظاہر جو نقصان ہے، اس سے بہت زیادہ نقصان وہ ہے جو جنگ کی صورت میں آدمی کو برداشت کرنا پڑتا ہے۔

مثال کے طور پر خلیج کے بحران میں اگر کویت اس پر راضی ہو جاتا کہ وہ اپنا غیر آباد جزیرہ وربہ (Warba Island) عراق کو پٹہ پر دیدے، جیسا کہ عراق کا مطالبہ تھا، تو یہ اس نقصان سے بہت کم تھا جو جنگ کی صورت میں کویت کو اٹھانا پڑا۔ اسی طرح خود عراق اگر کویتی جزیرہ کے بارہ میں اپنے مطالبہ سے باز آجاتا اور اپنی موجودہ جغرافی حالت پر قانع رہتا تو یہ اس کے لئے اس نقصان سے ہزاروں گنا کم ہوتا جو جنگ کے بعد اس کے نتیجہ میں عراق کے حصہ میں آیا۔

انسان جب بھی کسی جنگ میں الجھتا ہے تو وہ جذباتی ہیجان کی حالت میں اس سے الجھتا ہے۔ اگر انسان ایسا کرے کہ ٹکراؤ پیش آنے کی صورت میں وہ رک کر ٹھنڈے دل سے غور کرے تو یقینی طور پر وہ جنگ کے مقابلہ میں امن کو ترجیح دے گا۔

جنگ کی طاقت ہتھیار ہے۔ مگر جس طرح فوج اور ہتھیار ایک طاقت ہے، اسی طرح امن کی تدبیر بھی ایک طاقت ہے۔ جس طرح ہتھیار دشمن کو زیر کرتا ہے۔ اسی طرح امن کی طاقت بھی دشمن کو زیر کرتی ہے۔ البتہ دونوں میں یہ فرق ہے کہ ہتھیار کو استعمال کرنا ہمیشہ تخریب کی قیمت پر ہوتا ہے، اور امن کی طاقت ایک تعمیری طاقت ہے۔ وہ اپنے آخری استعمال کے بعد بھی تعمیری رہتی ہے۔ جنگ کی تدبیر اختیار کرنے سے نئے شدید تر مسائل پیدا ہو جاتے ہیں۔ جب کہ پر امن تدبیر مسئلہ کو اس طرح حل کرتی ہے کہ وہ کوئی نیا مسئلہ پیدا ہونے نہیں دیتی۔

بے ترتیب نماز

ایک شخص اگر ایسا کرے کہ وہ نماز پہلے پڑھ لے اور وضو اس کے بعد کرے تو ایسے آدمی کو نماز پڑھنے والا نہیں کہا جائے گا۔ شریعت کی نظر میں وہ ایک سرکش آدمی ہے نہ کہ نمازی آدمی۔ اگر کوئی شخص اس قسم کی بے ترتیب نماز پڑھے تو اگرچہ وہ بظاہر نماز کے تمام اجزا کو دہرا رہا ہوگا مگر اس کی بے ترتیبی اس کی نماز کو باطل کر دے گی۔ کوئی بھی عالم یا فقیہ اس کو نمازی تسلیم نہیں کرے گا۔

دنیا میں آپ کو ایسا کوئی مسلمان نہیں ملے گا جو اس قسم کی بے ترتیب نماز پڑھے۔ کیوں کہ وہ نماز کے معاملہ میں اس مسئلہ کو اچھی طرح جانتا ہے۔ اس کو یقین ہے کہ ایسی بے ترتیب نماز خدا کے یہاں قبول ہونے والی نہیں۔ مگر ایک اور معاملہ میں ہر جگہ کے مسلمان اسی قسم کی "نماز" پڑھنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ وہ چاہتے ہیں کہ پہلے "نماز" پڑھ لیں، اور اس کے بعد "وضو" کریں۔ اس تبدیلی (یا تحریف) کے باوجود ان کو مجاہد اسلام کا خطاب مل رہا ہے۔

یہ وہ لوگ ہیں جو اپنے اعلان کے مطابق، اسلامی حکومت یا اسلامی نظام قائم کرنے کا نعرہ لگا رہے ہیں۔ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کا طریقہ یہ تھا کہ پہلے آپ نے لمبی مدت تک رات دن محنت کر کے لوگوں کا ذہن بنایا۔ اس کے بعد اسلامی قانون کا نفاذ کیا۔ مگر موجودہ زمانہ کے مجاہدین اسلام اس کے برعکس یہ چاہتے ہیں کہ پہلے حکومت پر قبضہ کریں، اس کے بعد افراد کا ذہن بنائیں۔

ان کا کہنا ہے کہ پہلے ملک حاصل کرو، اس کے بعد اسلامی زندگی کی تعمیر کرو۔ پہلے فاسد حکمراں کو ہلاک کرو، اس کے بعد صالح قیادت پیدا کرو۔ پہلے سینما ہاؤس کی عمارت کو توڑو، اس کے بعد سینما بینی کا خاتمہ کرو۔ پہلے سیاسی تبدیلی لے آؤ، اس کے بعد افراد کا ذہن بدلو۔ پہلے وزارت اعلام پر قبضہ کرو، اس کے بعد وسائل اعلام کو اسلام کے لیے استعمال کرو۔

اس قسم کی تمام کارروائیاں "پہلے نماز اور اس کے بعد وضو" کی مصداق ہیں۔ معروف نماز کی ترتیب چونکہ تسلسل کے ساتھ زمانۂ نبوت سے چلی آرہی ہے، اس لیے تسلسل اور تواتر نے اس کی ہیئت کو لوگوں کی نظر میں اٹل بنا دیا ہے۔ وہ اس کے خلاف سوچنے کی جرأت نہیں کرتے۔ اس کے برعکس اسلامی حکومت کے قیام کے بارے میں اس قسم کا عملی تواتر یا مسلسل مشاہدہ موجود نہیں۔ اس لیے اس کی ترتیب کا معاملہ لوگوں کو اس

طرح اُس نظر نہیں آتا جیسا کہ نماز کا نظر آتا ہے۔ حالاں کہ شرعی حکم یا سنتِ رسول ہونے کے اعتبار سے دونوں میں کوئی فرق نہیں۔

"پہلے اقتدار اور اس کے بعد ذہن سازی" کا نظریہ اگر صحیح ہوتا تو خدا کے تمام پیغمبر سب سے پہلے اس نظریہ پر عمل کرتے۔ مگر واقعات بتاتے ہیں کہ مواقع ملنے کے باوجود انھوں نے ایسا نہیں کیا۔

رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کو مکہ کے لوگوں کی طرف سے یہ پیش کش کی گئی کہ اگر آپ اپنی اس دعوت کے ذریعہ حکومت کے طالب ہیں تو ہم آپ کو اپنے اوپر حاکم بنا لیتے ہیں (وان کنت تریـد بہ ملکاً ملکناك علینا، سیرۃ ابن ہشام، الجزء الاول، صفحہ ۳۱۵) مگر آپ نے حکومت کو قبول کرنے سے انکار کر دیا۔ آپ اقتدار سے الگ رہ کر توحید اور آخرت کے عقیدہ کو لوگوں کے دلوں میں داخل کرنے کی کوشش کرتے رہے۔

اس سے پہلے حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ساتھ یہی واقعہ ایک اور شکل میں پیش آیا۔ اللہ تعالیٰ نے آپ کو مصر میں مبعوث کیا۔ وہاں آپ نے فرعون کے سامنے توحید کی دعوت پیش کی۔ لمبے عرصہ تک آپ جدوجہد کرتے رہے۔ مگر فرعون نے آپ کی دعوت قبول نہ کی۔ یہاں تک کہ اللہ کی نظر میں وہ قابلِ سزا ٹھہرا۔ اس کے بعد فرعون اور اس کا پورا لشکر سمندر میں غرق کر دیا گیا۔ فرعون کی فوجی طاقت مکمل طور پر ختم ہو گئی۔

اب حضرت موسیٰ کے لیے موقع تھا کہ وہ اپنی قوم کے ساتھ لوٹ آئیں اور مصر کے خالی تخت پر بیٹھ جائیں۔ وہ مصر کے شاہی محل اور اس کے ایوانِ حکومت پر قبضہ کر لیں۔ اس طرح اقتدار حاصل کر لینے کے بعد وہ مصر کے لوگوں کا یا بنی اسرائیل کا ذہن بدلنے کا کام کریں۔ مگر حضرت موسیٰ علیہ السلام نے ایسا نہیں کیا۔ مصر میں سیاسی قبضہ کے مواقع ہونے کے باوجود وہ مصر کو چھوڑ کر صحرائے سینا میں چلے گئے۔ اور وہاں دعوتی انداز میں بنی اسرائیل کی اصلاح و تربیت کا کام کرتے رہے۔ تربیت کا یہ کام جب ۴۰ سال میں مکمل ہو گیا، اس وقت بنی اسرائیل نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کے بعد حضرت یوشع بن نون کی قیادت میں سیاسی اور فوجی اقدام کیا، اور عناسہ کو مغلوب کرکے شام و فلسطین پر اپنی حکومت قائم کی۔

کچھ لوگ یہ کہتے ہیں کہ موجودہ زمانہ میں ریڈیو اور ٹیلی وژن جیسی چیزوں کی ایجاد نے ہمارے لیے نئے مواقع پیدا کر دیے ہیں۔ یہ ذہن سازی کے نہایت وسیع اور کارگر ذرائع ہیں۔ مگر ان کو استعمال کرنے کے لیے اقتدار کا ہونا ضروری ہے۔ اس لیے آج کی ضرورت یہ ہے کہ پہلے اقتدار پر قبضہ کر لیا جائے، اس کے بعد نیوز میڈیا اور الکٹرانک میڈیا کو استعمال کرکے عوام کی دینی تربیت کی جائے۔ اس طرح خود ذہن سازی

کے کام کا تقاضا ہے کہ پہلے اقتدار پر قبضہ حاصل کیا جائے تاکہ تربیت عوام کے اس موثر ذریعہ کو اسلام کے حق میں استعمال کیا جاسکے۔

مگر یہ محض خوبصورت الفاظ ہیں۔ اس کے سوا اس کی کوئی حقیقت نہیں۔ واقعہ یہ ہے کہ جس طرح وضو اور نماز کی ترتیب ابدی ہے اسی طرح ذہنی انقلاب اور حکومتی انقلاب کی ترتیب بھی ابدی ہے۔ دورِ اوّل میں جس طرح انقلاب لایا گیا، بعد کے دور میں بھی اگر انقلاب لایا جاسکتا ہے تو اسی طرح لایا جاسکتا ہے۔ اس کے سوا دوسرا ہر طریقہ وقت کا ضیاع ہے، اس کے سوا اور کچھ نہیں۔

تجربات اس نظریہ کو غلط ثابت کرنے کے لیے کافی ہیں۔ مثال کے طور پر جنرل محمد ضیاء الحق نے ۱۹۷۷ میں پاکستان کے اقتدار پر قبضہ کر لیا۔ اور ساڑھے گیارہ سال کی طویل مدت تک پاکستان کے مطلق حکمراں بنے رہے۔ پاکستان کے اقتدار پر قابض ہونے کے بعد، دوسری بہت سی کارروائیوں کے علاوہ انھوں نے یہ کیا کہ ایک اسلام پسند لیڈر (محمود اعظم فاروقی) کو اطلاعات ونشریات کے محکمہ کا وزیر بنا دیا۔

اس کے بعد وہ مہم پوری طرح جاری کر دی گئی جس کو میڈیا کے ذریعہ عوام کی دینی تربیت کہا جاتا ہے۔ مگر طویل کوشش کے باوجود اس کا ایک فی صد فائدہ بھی حاصل نہیں ہوا۔ پاکستان کا معاشرہ مزید بگڑتا چلا گیا۔ یہاں تک کہ ضیاء الحق صاحب کی موت کے بعد پاکستان کا جو پہلا الکشن (نومبر ۱۹۸۸) ہوا، اس میں پاکستان کے عوام نے اسلامی نظام کے حامیوں کو چھوڑ کر ان لوگوں کو مرکزی اقتدار پر بٹھا دیا جو بالاعلان طور پر سیکولر نظام کے حامی تھے۔

داعی کا مقام

حضرت موسیٰ علیہ السلام کے زمانہ میں بنی اسرائیل کے ساتھ سخت ترین واقعات پیش آئے۔ وقت کی جابر سلطنت کے مقابلہ میں وہ بالکل بے یار و مددگار ہوگئے۔ پھر بھی اللہ نے معجزاتی طور پر ان کو بچا لیا۔ مصر سے نکل کر وہ ایک ایسے غیر آباد علاقہ میں پہنچے جہاں خشک بیابان اور چٹیل پہاڑوں کے سوا اور کچھ نہ تھا۔ مگر اللہ نے چٹانوں کے اندر سے ان کے لئے پانی کے چشمے جاری کر دئے اور ان کی غذا کے لئے اوپر سے من و سلویٰ نازل فرمایا۔

بنی اسرائیل کے ساتھ اللہ کا یہ معاملہ قرآن میں محض ایک قصہ کے طور پر بیان نہیں ہوا ہے۔ بلکہ اس میں بہت بڑا سبق ہے۔ یہ تاریخ کی زبان میں داعی کے مقام کو بتایا گیا ہے۔ اللہ کے پیغام کا علم بردار بننے کے لئے آدمی کو اللہ کی سطح پر جینا پڑتا ہے۔ اس کو اپنے آپ کو عالم آخرت سے اتنا زیادہ متعلق کرنا پڑتا ہے کہ موجودہ دنیا کے سرے اس کے ہاتھ سے چھوٹنے لگتے ہیں۔ حق کا داعی وہی شخص بن سکتا ہے جو اپنے آپ کو اتنا زیادہ غیر اللہ سے کاٹے اور اللہ کے ساتھ اپنے کو اتنا زیادہ جوڑے کہ اس کی ہستی تمام تر اللہ رب العالمین کے اوپر منحصر ہو جائے۔ وہ عجز کے اس مقام پر پہنچ جائے جہاں خدا کی نصرت ہی اس کے لئے واحد سہارا ہو۔ اس کا شعورِ احتیاج اتنا کامل ہو جائے کہ پانی کا ہر گھونٹ اس کو خدا کی طرف سے اترا ہوا گھونٹ معلوم ہونے لگے، کھانے کا ہر لقمہ جو وہ اپنی حلق سے اتارے، اس کو محسوس ہو کہ یہ براہ راست اس کے پاس خدا کی طرف سے بھیجا گیا ہے۔ عبدیت کے اس کامل شعور کی سطح پر آدمی کی زبان سے جو کلمات نکلتے ہیں، اسی کا نام دعوت ہے۔ اس کے بغیر جو لکھا یا بولا جائے وہ تصنیف اور تقریر ہے نہ کہ اللہ کے پیغام کی پیغام رسانی۔

ایک راہ گیر نے دیکھا کہ ریلوے کا پل ٹوٹ گیا ہے۔ اتنے میں اس کو ایک اکسپریس ٹرین طوفانی رفتار کے ساتھ آتی ہوئی نظر آئی۔ اس وقت سیکڑوں مسافروں سے لدی ہوئی ٹرین کو بچانے کی ایک ہی صورت تھی: وہ اپنے خون سے اپنے کپڑے کو لال کرے اور اس کو لے کر ریلوے لائن پر کھڑا ہو جائے۔ اس نے ایسا ہی کیا۔ راہ گیر نے اپنے خون کی قیمت دے کر اپنے آپ کو وہاں پہنچا دیا جہاں امکانی طور پر دوسرے مسافر پہنچنے والے تھے۔ اس کے بعد ہی یہ ممکن ہو سکا کہ وہ دوسرے مسافروں کو آنے والے خطرہ سے آگاہ کرے۔ ایک شخص جو آگ میں جل رہا ہو وہی یہ کہہ سکتا ہے کہ "آگ جلاتی ہے"۔ وہ شخص جس پر جلنے کا تجربہ نہیں گزرا، اس کے لئے "آگ جلاتی ہے" کا جملہ محض دور کا ایک جملہ ہے، وہ آگ کے جلانے کی خبر نہیں ہے۔ داعی اگر اپنے دنیوی امکانات کو بچانے کی خاطر زمانہ سازی کرے، وہ اپنے دنیوی نقصانات کی خاطر لوگوں سے لڑے، وہ عوامی مقبولیت کو باقی رکھنے کے لئے ان کی پسندیدہ بولی بولنے لگے۔ وہ بربادی کے اندیشہ کی بنا پر مصلحت پرستی کا طریقہ اختیار کرے۔ تو یہ اس کے مشن کی نفی کے ہم معنی ہوگا۔ اس طرح وہ اپنے ظاہری فائدوں کو محفوظ کر لے گا، مگر اس کا دوسرا نتیجہ یہ ہوگا کہ وہ داعیانہ تجربات سے محروم ہو جائے گا۔ وہ زبان سے آخرت کی بات کرے گا مگر عملاً دنیا میں جی رہا ہوگا۔ وہ لفظی طور پر اپنے آپ کو خدا کا داعی ظاہر کرے گا مگر حقیقت کے اعتبار سے اس کا پورا وجود غیر اللہ میں اٹکا ہوا ہوگا۔ وہ تحریر و تقریر میں حق پرستی کی نمائندگی کرے گا مگر اپنی روزمرہ کی زندگی میں وہ خود پسندی

اور مفاد پرستی کو اپنا مذہب بنائے ہوئے ہوگا۔ حقیقت یہ ہے کہ دنیا کی بربادی کی قیمت پر ہی آخرت کی آبادی کا پیغام دیا جا سکتا ہے۔ جو اپنے آپ کو دنیا کی بربادی سے بچائے، وہ گویا اپنے آپ کو مقام دعوت تک پہنچنے سے بچا رہا ہے۔ ایسے شخص کا دعوتی تقریر کرنا ایسا ہی ہے جیسے کوئی شخص رات دن دنیا کو سمیٹنے میں لگا ہوا ہو اور دوسرے سے کہے کہ زہد اور قناعت کا طریقہ اختیار کرو۔

کسی بندۂ خدا کی زبان سے حق کی آواز کا اٹھنا مدعو کے اعتبار سے اس کے اوپر خدا کی حجت کا اتمام ہے۔ اور داعی کے اعتبار سے اس کو دعوت حق کا کریڈٹ دینا ہے۔ بندوں کی نظر میں کوئی دعوت اسی وقت دعوت ہے جب کہ وہ شاعری اور تفریح کی سطح پر نہ دی جا رہی ہو بلکہ حقیقی زندگی کی سطح پر کسی روح سے ابلی ہو۔ اسی طرح کوئی بندہ اللہ کی نظر میں اسی وقت دعوتی شرف کا مستحق بنتا ہے جب کہ وہ اللہ کا ہم صحبت بن کر دعوت خداوندی کے لئے اٹھا ہو۔ اس کے بغیر نہ بندوں کی نظر میں اس کی کوئی قیمت ہے اور نہ اللہ کی نظر میں۔

ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

من احبّ دنیاہ اضرّ بآخرتہ ومن احبّ آخرتہ اضرّ بدنیاہ فآثروا ما یبقیٰ علیٰ ما یفنیٰ (مسند احمد، بیہقی)

جو اپنی دنیا سے محبت کرے گا وہ اپنی آخرت کو کھو دے گا اور جو اپنی آخرت سے محبت کرے گا وہ اپنی دنیا کو کھو دے گا۔ پس جو باقی رہنے والا ہے اس کو ترجیح دو اس پر جو فنا ہونے والا ہے۔

جب آدمی دنیا میں آرام اور عزت سمیٹنا چاہتا ہے تو اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ آخرت کی طرف سے اس کی توجہ ہٹ جاتی ہے۔ اسی طرح جب ایک شخص کو آخرت کی فکر لگتی ہے تو بالکل قدرتی طور پر ایسا ہوتا ہے کہ دنیا کی چیزوں کے لئے اس کی فکر کم ہو جاتی ہے اور نتیجۃً اس کو دنیا کے معاملہ میں نقصان پر قانع ہونا پڑتا ہے۔

یہی واقعہ داعی کے معاملہ میں مزید شدت کے ساتھ پیش آتا ہے۔ ایک شخص جو ذاتی طور پر مومن و مسلم بننا چاہے، اس کے مقابلہ میں اس کی ذمہ داریاں کئی گنا زیادہ بڑھ جاتی ہیں جو دوسروں کو ایمان و اسلام کی دعوت پہنچانا چاہتا ہو۔ عام آدمی اگر مومن ہے تو داعی کو شاہد بننا پڑتا ہے۔ دوسرے لوگ جس چیز پر صرف ایمان لائے ہوئے ہیں، داعی کے لئے ضروری ہو جاتا ہے کہ وہ اس کو "دیکھے" تاکہ دیکھی ہوئی چیز کی طرح وہ دوسروں کو اس کی بابت خبردار کر سکے۔

غیبی حقیقتوں کو اس دنیا میں صرف تصور کی نگاہ سے دیکھا جا سکتا ہے، اس لئے یہ دیکھنا اس وقت وقوع میں آتا ہے جب کہ نظر آنے والی چیزوں سے وہ اپنی توجہ کو اتنا زیادہ ہٹائے کہ اس کی تمام توجہات عالم آخرت کی طرف لگ جائیں۔ آخرت کو دیکھنا صرف اس وقت ممکن ہوتا ہے جب کہ آدمی دنیا کو نہ دیکھنے پر راضی ہو جائے —— دنیا کو کھونے والا ہی آخرت کو پاتا ہے اور جو شخص دنیا میں بے توجہ ہو جائے وہی وہ شخص بنتا ہے جو آخرت کو دیکھے اور دوسروں کو اسے دکھائے۔ جس کی نگاہیں دنیا میں اٹکی ہوئی ہوں، وہ کبھی آخرت کو دیکھنے والا نہیں بن سکتا۔ اس لئے وہ کبھی داعی کے مقام پر بھی کھڑا نہیں ہو سکتا۔ دعوت آخرت کی واحد قیمت بربادیٔ دنیا ہے۔ جو اپنی دنیا کو برباد کرنے کے لئے تیار نہ ہو اس کو آخرت کی دعوت کے میدان میں قدم بھی نہیں رکھنا چاہئے۔

”آپ ہم کو اسلام کی طرف بلاتے ہیں“ ایک غیر مسلم نے کہا ”مگر اسلام وہی تو ہے جس نے موجودہ ایران میں مسلمانوں مسلمانوں کو لڑا رکھا ہے۔ پاکستان میں اسی اسلام کے نام پر مسلمان آپس میں لڑ رہے ہیں اور ان کی لڑائی ختم ہونے میں نہیں آتی۔ کیا اسی آپسی لڑائی والے دین کو اب آپ ہمارے ملک میں بھی داخل کرنا چاہتے ہیں“

غیر مسلم بھائی کی اس بات کا میرے پاس کوئی جواب نہ تھا۔ مجھے ”ٹیڑھی کھیر“ کا لطیفہ یاد آیا۔ کہا جاتا ہے کہ ایک نابینا کو ایک شخص نے کھانے کی دعوت دی ”آپ کیا کھلائیں گے“ نابینا نے پوچھا۔

”کھیر کھلاؤں گا“

”کھیر کیا چیز ہوتی ہے“ نابینا نے دوبارہ سوال کیا۔

”کھیر سفید ہوتی ہے“

”کیسی سفید“

”جیسے بگلا“

”بگلا کیسا ہوتا ہے۔ میں نے تو اس کو کبھی نہیں دیکھا“ اب دعوت دینے والے نے اپنے ہاتھ کو بگلے کی شکل کا بنا کر نابینا کے ہاتھ میں دیا اور کہا کہ بگلا ایسا ہوتا ہے۔ نابینا نے ٹٹول کر دیکھا تو وہ اس کو ایک ٹیڑھی سی چیز معلوم ہوئی۔ اس نے سمجھا کہ کھیر کوئی ٹیڑھی میڑھی چیز ہوتی ہے۔ اس نے سوچا کہ ایسی ٹیڑھی چیز اگر میں نے کھائی تو کہیں وہ میرے گلے میں نہ پھنس جائے۔ اس نے کہا ”بھائی! مجھے ایسی ٹیڑھی کھیر سے معاف رکھو۔ میں تمہاری دعوت نہیں کھاؤں گا“

موجودہ زمانہ میں مسلمانوں نے بھی دین اسلام کو ایسا ہی ٹیڑھا دین بنا رکھا ہے۔ اسلام کے نام پر طرح طرح کے مذہبی، سیاسی اور معاشی جھگڑے برپا ہیں۔ اسلام دین رحمت تھا۔ مگر موجودہ زمانہ میں اس کو دین منازعت بنا کر رکھ دیا گیا ہے۔ ”ٹیڑھا دین“ ہر ایک لیے پھرتا ہے۔ مگر سیدھا سچا دین کسی کی سمجھ میں نہیں آتا۔ اسلام کے یہ نادان دوست اگر اسلام کا نام لینا چھوڑ دیں تو وہ زیادہ بہتر طور پر اسلام کی خدمت کریں گے۔

یہی نہیں، بلکہ مسلمانوں نے اپنے عمل سے اسلام کو دوسروں کی نظر میں حقارت کا موضوع بنا دیا ہے، بجائے اس کے کہ وہ عظمت کا موضوع بنے۔

منافق کے ساتھ برتاؤ

امام شافعی نے اپنی کتاب الام میں ایک روایت ان الفاظ میں نقل کیا ہے:

اخبرنا مالک عن ابن شہاب عن عطاء بن یزید اللیثی عن عبید اللہ بن عدی بن الخیار ان رجلاً سارّ النبی صلی اللہ علیہ وسلم فلم ندر ما سارّہ حتی جہر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فاذا ہو یشاورہ فی قتل رجل من المنافقین۔ فقال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم الیس یشہد ان لا الہ الا اللہ۔ قال بلی ولا شہادۃ لہ فقال الیس یصلی قال بلی ولا صلاۃ لہ۔ فقال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اولئک الذین نہانی اللہ تعالیٰ عنہم۔

ایک شخص نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے چپکے چپکے بات کی۔ ہم نے نہیں جانا کہ وہ چپکے چپکے کیا کہہ رہا ہے۔ یہاں تک کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم باآواز بلند بولے تو ہم نے جانا کہ وہ منافقین میں سے ایک شخص کو قتل کرنے کا مشورہ کر رہا تھا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کے جواب میں کہا، کیا وہ لا الہ الا اللہ کی شہادت نہیں دیتا ہے۔ آدمی نے کہا ہاں، مگر اس کی شہادت شہادت نہیں ہے۔ آپ نے فرمایا کیا وہ نماز نہیں پڑھتا ہے۔ آدمی نے کہا ہاں، مگر اس کی نماز نماز نہیں ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: یہ وہ لوگ ہیں جن کی طرف سے اللہ نے مجھ کو منع کر دیا ہے۔

بخاری و مسلم نے عبادۃ بن الصامت سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہم کو بلایا پھر بیعت لی۔ آپ نے ہم سے سمع وطاعت پر بیعت لی خواہ پسند ہو یا ناپسند، مشکل ہو یا آسان۔ اور یہ کہ ہم اپنے اوپر ترجیح دئے جانے کو گوارا کریں اور اہلیت والے سے معاملہ میں نزاع نہ کریں الا یہ کہ تم کھلا ہوا کفر دیکھو جس کے لئے تمہارے پاس خدا کی طرف سے دلیل ہو (بایعنا علی السمع والطاعۃ فی منشطنا ومکرہنا وعسرنا ویسرنا واثرۃ علینا وان لا ننازع الامر اہلہ الا ان تروا کفراً بواحاً عندکم من اللہ فیہ برہان)

روایات سے ثابت ہے کہ اللہ تعالیٰ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو بتا دیا تھا کہ فلاں فلاں اشخاص اگرچہ ظاہری طور پر مسلمان بنے ہوتے ہیں مگر حقیقۃً وہ منافق ہیں۔ اس کے باوجود

آپ نے ان سے مسلمانوں جیسا معاملہ فرمایا اور ان کے ظاہر احوال پر انھیں باقی رکھا۔

مسلم، احمد، ابن ماجہ اور ابو داؤد نے اسامہ بن زید سے نقل کیا ہے کہ وہ کہتے ہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہم کو ایک سریہ میں بھیجا۔ ہم صبح کو جہینہ کے علاقہ میں پہنچے۔ وہاں میں نے ایک آدمی کو پکڑا۔ اس نے فوراً لاالہ پڑھا۔ پھر بھی میں نے اس کو نیزہ مار دیا۔ اس کے بعد میرے دل میں شبہ پیدا ہوا۔ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اس کا ذکر کیا۔ آپ نے فرمایا: کیا اس نے لاالہ الا اللہ کہا پھر بھی تم نے اس کو قتل کر دیا (قال لا الہ الا اللہ وقتلتہ) میں نے کہا اے رسول اللہ اس نے ہتھیار کے ڈر سے کہا تھا۔ آپ نے فرمایا: پھر کیوں نہ تم نے اس کا دل چیر کر دیکھا تاکہ تم کو معلوم ہو کہ اس نے واقعۃً کہا ہے یا نہیں کہا ہے (افلا شققت علی قلبہ حتی تعلم اقالہا ام لا) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس جملہ کو برابر دہراتے رہے، یہاں تک کہ میں نے تمنا کی کہ کاش میں آج مسلمان ہوا ہوتا۔

حضرت عمر بن الخطاب نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کہا کہ مجھے عبد اللہ بن ابی (رئیس المنافقین) کے قتل کی اجازت دیجئے۔ مگر آپ نے ان کو اجازت نہیں دی۔ اسی طرح ابن ابی کے لڑکے عبد اللہ نے ابن ابی کو قتل کرنے کی اجازت مانگی جب کہ غزوہ مریسیع میں اس کا نفاق ظاہر ہو چکا تھا۔ رسول اللہ صلی اللہ نے انکار فرمایا اور کہا: بلکہ ہم اس سے نرمی کا معاملہ کریں گے اور اس سے اچھا تعلق رکھیں گے (بل نترفق بہ و نحسن صحبتہ)

اس سے معلوم ہوا کہ کسی کو منافق قرار دیکر اس کو قتل کرنا سراسر اسلامی تعلیمات کے خلاف ہے۔ مخلص اور منافق کا تعلق اللہ سے ہے۔ وہی دونوں کو الگ کر کے ہر ایک کو اس کے عمل کے مطابق بدلہ دے گا۔ ہماری ذمہ داری یہ ہے کہ ہم لوگوں سے ظاہری حالات کے مطابق معاملہ کریں۔

مدینہ کے منافقین یہود سے ملے ہوئے تھے وہ اسلام کے خلاف سازشیں کرتے تھے۔ وہ بظاہر مسلمان مگر اندر سے نامسلمان تھے۔ اس کے باوجود ان کو قتل نہیں کیا گیا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو مدینہ میں اقتدار حاصل تھا مگر آپ ان کی حقیقت جانتے ہوتے ان کو برداشت کرتے رہے، یہاں تک کہ منافقین اپنی طبعی موت مر کر اللہ کے یہاں حساب دینے کے لئے پہنچ گئے۔

صبر اور دعوت

صبر داعی کا اخلاق ہے۔ صبر ہی کے ذریعہ وہ حالات پیدا ہوتے ہیں جب کہ کوئی شخص دعوتی مواقع کو استعمال کر سکے۔ جو آدمی ناخوش گوار باتوں پر صبر کرنے کے لیے تیار نہ ہو وہ اس دنیا میں کبھی داعی کا مقام حاصل نہیں کر سکتا۔

سر جیمز جینز مشہور انگریز سائنسداں ہے۔ اس نے طبیعیات اور فلسفہ (Physics & philosophy) کے نام سے ۱۹۴۱ میں ایک کتاب لکھی۔ اس کتاب کے دیباچہ میں اس نے اعتراف کیا کہ کائنات کے سائنسی مطالعہ نے ہم کو جہاں پہنچایا ہے اس سے بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ حقیقت کا دروازہ کھولنا ممکن ہے۔ بشرطیکہ ہم اس کا ہینڈل حاصل کر سکیں :

> It almost seems to suggest that the door may be unlocked, if only we could find the handle. (p. 216)

انگریز سائنس داں نے جس وقت یہ سطریں لکھی ہیں عین اس وقت ساری دنیا کے مسلمان انگریزوں کی سیاسی بالادستی پر بھڑک کر ان کے خلاف خوں آشام لڑائی میں مصروف تھے۔ وہ انگریز کو صرف ایک قابل نفرت دشمن کے روپ میں دیکھ رہے تھے۔ اگر وہ انگریز کی سیاسی بالادستی پر وقتی طور پر صبر کر لیتے تو اچانک انھیں دکھائی دیتا کہ انگریز قوم حقیقت کے دروازے کھولنے کے لیے جس " ہینڈل " کی تلاش کر رہی ہے وہ ہینڈل ان کے پاس قرآن کی صورت میں موجود ہے۔

اس واقفیت کی صورت میں انگریز کے بارے میں ان کی پوری نفسیات بدل جاتی۔ اب وہ انگریز کو اپنا مدعو سمجھتے نہ کہ اپنا حریف۔ اس کے بعد وہ انگریز کی ہلاکت چاہنے کے بجائے اس کی ہدایت چاہنے لگتے۔ وہ انگریز کی اصلاح کے لیے دعا کرتے اور اس کے خیر خواہ بن کر اس سے یہ کہتے کہ حقیقت کی منزل تک پہنچنے کے لیے تم کو جس چیز کی ضرورت ہے وہ تمہارے خدا نے پیشگی طور پر قرآن کی صورت میں تمہارے لیے بھیج دیا ہے۔

صبر دعوت کی لازمی شرط ہے۔ جہاں صبر نہ ہو وہاں دعوت بھی یقینی طور پر نہیں ہوگی۔

داعی اور مدعو

سڑک پر ہر وقت آدمی چلتے رہتے ہیں۔ مگر آنے جانے والوں میں کبھی "ملاقات" نہیں ہوتی۔ کیونکہ ایک دائیں سے نکل جاتا ہے اور دوسرا بائیں سے۔ جب کہ ملاقات کے لئے ضروری ہے کہ دونوں آدمی ایک رخ پر چل رہے ہوں۔

"دائیں بائیں" کا اصول سڑک کے لئے بہت کارآمد ہے مگر وہ ہر موقع کے لئے کارآمد نہیں۔ زندگی کے ایسے راستے بھی ہیں جہاں ملاپ درکار ہے نہ کہ ادھر اُدھر سے کترا کر نکل جانا۔ ان راستوں میں آپ کو بھی اسی رخ پر چلنا پڑے گا جس رخ پر دوسرا چل رہا ہے۔ ورنہ آپ ان راستوں میں کامیاب نہیں ہو سکتے۔

دعوت کا راستہ ایسا ہی ایک راستہ ہے۔ یہاں اعراض کے بجائے ملاقات کا اصول اختیار کرنا پڑتا ہے۔ ورنہ داعی اور مدعو کا سامنا ہی نہ ہوگا اور جب سامنا نہ ہوگا تو دعوت کس طرح پیش کی جائے گی اور وہ کس کے کان میں پڑے گی۔

مدعو اگر انگریزی زبان بولنے والا ہے تو آپ ہندی زبان بول کر اس کو اپنی دعوت سے باخبر نہیں کر سکتے۔ ضروری ہے کہ داعی بھی وہی زبان بولے جو مدعو کی زبان ہے۔ مدعو اگر ایک قومیت کا ہنگامہ کھڑا کئے ہوئے ہے تو آپ دوسری قومیت کا ہنگامہ کھڑا کر کے اس کو اپنے پیغام سے قریب نہیں کر سکتے۔ اس کے بجائے آپ کو یہ کرنا ہوگا کہ قومیت سے بلند ہو کر ایسی اجتماعی اساس تلاش کریں جو دونوں کے درمیان مشترک ہو۔ مدعو اگر آپ سے روٹھ کر اپنا منھ پھیرے ہوئے ہے تو آپ ایسا نہیں کر سکتے کہ اپنا منھ بھی دوسری طرف پھیر لیں۔ اس کے بجائے آپ کو یک طرفہ طور پر شکایات کو ختم کرنا ہوگا تاکہ دونوں کے درمیان وہ معتدل فضا پیدا ہو جو کسی سنجیدہ پیغام کو سنانے کے لئے ضروری ہے۔

قومی مسلک میں جو چیز امرت ہے وہ دعوتی مسلک میں زہر ہے۔ مفاد پرستانہ سیاست میں جو اصول زندگی کا پہلا گر ہے وہ دعوت حق کی سیاست میں صرف اس قابل ہے کہ اس کو مکمل طور پر ترک کر دیا جائے۔ شخصی قیادت کے کاروبار میں جو چیز کامیابی کا زینہ ہے وہ دعوت کے عمل میں صرف ناکامی تک پہنچانے والا ہے۔ ایک طریقہ کو دوسرے طریقہ سے کوئی مناسبت نہیں ہے۔

داعی ہمیشہ مدعو کی رعایت کرتا ہے اور غیر داعی صرف اپنی رعایت کرنا جانتا ہے۔ داعی کو حق کا جھنڈا کھڑا کرنے کی فکر ہوتی ہے اور غیر داعی کو صرف اپنا جھنڈا کھڑا کرنے کی۔ داعی مدعو کا خیر خواہ ہوتا ہے اور غیر داعی صرف اپنا۔

دعوتی مشن

ایک غیر مسلم ایک مولوی صاحب کے یہاں آیا اور یہ سوال کیا کہ اسلام کیا ہے۔ مولوی صاحب نے بہت اچھے انداز میں اس کے سامنے توحید اور آخرت اور مساوات بنی آدم کی تشریح کی۔ غیر مسلم جب چلا گیا تو کچھ مسلمان جو وہاں بیٹھے ہوئے یہ باتیں سن رہے تھے، انھوں نے مولوی صاحب سے کہا: حضرت، ہم آپ کے پاس آتے ہیں تو آپ ہم کو وسیلہ اور زیارت قبر جیسے مسائل کی تفصیل بتاتے ہیں۔ اور غیر مسلم نے آپ سے اسلام کے بارہ میں پوچھا تو آپ نے اس کو دوسری باتیں بتائیں۔ کیا ہمارا اسلام اور ہے اور ان کا اسلام اور۔ اس کے جواب میں مولوی صاحب نے کہا:
"اجی، یہ غیر مسلم ہمارے ان جھگڑوں کو کیا سمجھیں گے۔ ان کو تو اسلام کی بنیادی باتیں ہی بتائی جا سکتی ہیں"

مسلمانوں کو آج جہاں دیکھئے، آپس کے جھگڑوں میں مبتلا ہیں۔ شیعہ اور سنی کا جھگڑا، دیوبندی اور بریلوی کا جھگڑا، حنفی اور اہل حدیث کا جھگڑا۔ ایک جماعت اور دوسری جماعت کا جھگڑا۔ اور یہ سب کچھ عین اسلام کے نام پر ہو رہا ہے۔ مسلمانوں کی موجودہ حالت کو دیکھئے تو ایسا معلوم ہوتا ہے گویا اسلام ان کے نزدیک صرف آپس کے بحث اور جھگڑے کا نام ہے۔

مگر یہی مسلمان جو آپس میں معمولی مسائل اور چھوٹی چھوٹی باتوں کے لئے جھگڑتے ہیں، انھیں کو اگر غیر مسلموں کے سامنے اسلام پیش کرنا ہو تو وہ سنجیدہ اور حقیقت پسند بن جاتے ہیں۔ وہ جھگڑے والی باتوں کو حذف کر کے ان کے سامنے وہ اسلام پیش کرتے ہیں جو بنیادی ہے اور جس میں ایک فرقہ اور دوسرے فرقہ کے درمیان کوئی اختلاف نہیں۔

اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ مسلمانوں کی تمام موجودہ خرابیوں کا سبب یہ ہے کہ وہ دعوت اسلام اور شہادت علی الناس کے کام سے ہٹ گئے ہیں۔ دوبارہ ان کی اصلاح کا واحد طریقہ یہ ہے کہ ان کو دعوت اسلام اور شہادت علی الناس کے کام پر لگایا جائے۔

دعوت عام کا کام عین اپنی فطرت کے اعتبار سے آدمی کو اسلام کی بنیادی باتوں کی طرف متوجہ کر دیتا ہے۔ اس کے بعد وہ فروعی چیزیں اپنے آپ حذف ہو جاتی ہیں جو اختلافات کا اصل سبب ہیں۔ غیر مسلموں میں خدا کے دین کو پہنچانے کا کام بیک وقت دعوتی ذمہ داری کی ادائیگی بھی ہے اور اسی کے ساتھ مسلمانوں کے اختلافات کو ختم کرنے کی موثر ترین تدبیر بھی۔

دعوت یا نفرت

پرانی دہلی کے ایک محلہ میں ایک شخص نے دکان کھولی۔ اس کے بعد محلہ کا ایک آدمی اس کی دکان پر آنے لگا۔ وہ روزانہ آتا اور دوکان پر بیٹھ کر محلہ والوں کی برائیاں بیان کرتا۔ دکاندار نے پہلے نرمی کے ساتھ اس کو اس قسم کی باتوں سے روکنے کی کوشش کی۔ مگر وہ نہ رکا۔ آخر دکاندار ایک روز ہاتھ باندھ کر اس کے سامنے کھڑا ہو گیا۔ اس نے کہا: میاں صاحب! بڑی مہربانی ہوگی اگر آپ میری دکان پر نہ آئیں۔ آپ جن لوگوں کی برائیاں کرتے ہیں وہ سب میرے گاہک ہیں۔ آپ کی باتیں سن کر اگر میرے دل میں ان کی نفرت آجائے تو میں ان کے ساتھ دکانداری نہیں کر سکتا۔ دکانداری پیار کا سودا ہے۔ وہ نفرت اور حقارت کا کاروبار نہیں۔

موجودہ زمانہ میں جو مسلمان اسلام کے مسائل پر لکھنے اور بولنے کے چیمپین بنے ہوئے ہیں، اسلام بھی ان سے بزبانِ خاموش کہہ رہا ہے کہ آپ کا بہت کرم ہوگا، اگر آپ لوگ میرے بارہ میں لکھنے اور بولنے کا موجودہ کام ختم کر دیں۔ کیوں کہ آپ کا سارا کلام منفی کلام ہے، اور یہ منفی کلام میرے تمام دعوتی امکانات کو مسلسل طور پر برباد کر رہا ہے۔

موجودہ زمانہ میں مسلمانوں کے جو لکھنے اور بولنے والے ہیں، وہ سب کے سب اس سادہ حقیقت سے بے خبر نظر آتے ہیں جس کو مذکورہ واقعہ میں ایک معمولی دکاندار نے اول روز جان لیا تھا۔ ہمارے لکھنے اور بولنے والے دعوت کا نام لیتے ہیں۔ وہ فخر کے ساتھ اپنے آپ کو داعی کہتے ہیں۔ مگر اس کے ساتھ وہ ایسی باتیں لکھنے اور بولنے میں مشغول ہیں جو مسلمانوں کے اندر اپنی مدعو قوموں کے خلاف نفرت اور بغض کی فصل اگانے والی ہوں۔

موجودہ مسلم دنیا میں جو لوگ لکھنے اور بولنے کا کام کر رہے ہیں۔ ان کے کلام کا مشترک خلاصہ ایک لفظ میں شکایت اور احتجاج ہے۔ ان میں سے ہر ایک کسی نہ کسی غیر مسلم فرقہ یا گروہ کی برائیاں بیان کرنے میں لگا ہوا ہے۔ کوئی مغربی مستشرقین کی سیہ کاریوں کا اعلان کر رہا ہے اور کوئی صہیونی یہودیوں کی مکاری کا۔ کوئی استعماری طاقتوں کے ظلم کا انشار کر رہا ہے اور کوئی صلیبی قوموں کی معاندانہ کارروائیوں کا۔ کوئی مسیحی مبلغین کی سازشوں کا انکشاف کر رہا ہے اور کوئی ہندو احیار پرستوں کے خفیہ منصوبوں کا۔

اسی طرح کوئی مسلم اقلیت کے خلاف غیر مسلم اکثریت کے امتیاز کے اعداد وشمار چھاپ رہا ہے۔ اور کوئی مسلمانوں کے ملی تشخص کو ختم کرنے کے لیے اغیار کی معاندانہ کوششوں پر فریاد کرنے میں مشغول ہے۔ وغیرہ

دعوت کی شریعت میں یہ تمام چیزیں ناجائز کے درجہ میں غلط ہیں۔ یہ تمام لوگ جن کے خلاف موجودہ قلمی اور لسانی جہاد کیا جا رہا ہے، وہ وہی ہیں جن پر ہمیں دعوت کے فرض کو انجام دینا ہے۔ وہ سب کے سب ہمارے لیے مدعو کے درجہ میں ہیں۔ مذکورہ قسم کی تقریریں اور تحریریں مسلسل طور پر مسلمانوں کو اپنے مدعو گروہ سے متنفر کر رہی ہیں۔ اور جن لوگوں کے خلاف آدمی کے دل میں نفرت پیدا ہو جائے، وہ ان کے اوپر دعوت کا عمل جاری نہیں کر سکتا۔

دعوت کا عمل محبت اور خیر خواہی کے سرچشمہ سے نکلنے والا عمل ہے۔ وہ نفرت اور بغض سے بھرے ہوئے سینہ سے ظاہر ہونے والا عمل نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن میں داعی کو یک طرفہ طور پر صبر اور اعراض کی روش پر قائم ہونے کا حکم دیا گیا ہے۔ دعوت اور صبر دونوں لازم اور ملزوم ہیں۔ جو لوگ مدعو کی زیادتیوں پر صبر نہ کر سکیں، وہ خدا کے دین کو خدا کے بندوں تک پہونچانے کام بھی نہیں کر سکتے۔

ایسی حالت میں مسلمانوں کے جو لکھنے اور بولنے والے یہ کر رہے ہیں کہ وہ مسلمانوں کی مدعو اقوام کے ظلم اور ان کی سازشوں کے خلاف فریاد کرنے کی ایجنسی لیے ہوئے ہیں، وہ درحقیقت شیطان کے ایجنٹ ہیں۔ شیطان چاہتا ہے کہ داعی اور مدعو کے درمیان تلخیوں کو خوب بڑھائے تاکہ داعی اپنے مدعو سے اتنا متنفر ہو جائے کہ اس کے دل میں مدعو کے اوپر دعوتی عمل کرنے کا جذبہ ہی باقی نہ رہے۔ یہی وہ کام ہے جو آج ہمارے تمام لکھنے اور بولنے والے انجام دے رہے ہیں۔ یہ بلاشبہ شیطان کے مقصد کی تکمیل ہے نہ کہ خدا کے منصوبہ کو بروئے کار لانے کی جدوجہد۔

مدعو نہ کہ حریف

منٹگو مری واٹ کی ایک کتاب ہے جس کا نام ہے اسلام کیا ہے (What is Islam) ڈھائی سو صفحات کی اس کتاب میں انگریز مصنف نے اسلام کا نظریاتی اور تاریخی جائزہ لیا ہے۔ آخر میں وہ کتاب کو ختم کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ یہ کتاب مغربی لوگوں کو اس قابل بنائے گی کہ وہ اس زندہ اور طاقت ور قوم کو زیادہ بہتر طور پر سمجھ سکیں جو کہ ان کی شریک بھی ہے اور ان کی حریف بھی:

This book will enable occidentals to understand better this living and powerful community which is both their partner and their rival.

اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ مسلمان کی تصویر آج دوسری قوموں کی نظر میں کیا ہے۔ یہ تصویر محض قومی ہے نہ کہ نظریاتی۔ دوسری قومیں ہم کو بس اس نظر سے دیکھتی ہیں کہ مسلمان دنیا کی آبادی کا ایک بڑا حصہ ہیں اور اس اعتبار سے وہ زمین کے دوسرے باسیوں کے لئے قومی شریک اور مادی حریف کی حیثیت رکھتے ہیں۔

ہر قوم کو دوسرے لوگ اسی خاص حیثیت سے جانتے ہیں جس حیثیت سے اس نے اپنے آپ کو دوسروں کی نظر میں متعارف کیا ہو۔ ہر قوم اپنی تصویر آپ بناتی ہے۔ جاپان کو لوگ ایک ٹیکنیکل معاشرہ سمجھتے ہیں۔ چین کو ایک جبری معاشرہ اور برطانیہ کو ایک جمہوری معاشرہ۔ ان قوموں کے بارے میں لوگوں کی یہ رائیں خود ان قوموں کے طرز عمل سے بنی ہیں نہ کہ دوسروں کی اپنی خیال آرائی سے۔ یہی معاملہ مسلمانوں کا بھی ہے۔ مغرب کے لوگ اگر ہم کو محض ایک جغرافی شریک یا مادی حریف کی حیثیت سے دیکھتے ہیں تو اس کی ذمہ داری خود ہمارے اوپر ہے نہ کہ دوسروں کے اوپر۔ ہم نے اسی روپ میں ان کی نظر میں اپنا تعارف کرایا ہے پھر وہ اس کے علاوہ کسی اور روپ میں ہم کو کس طرح دیکھ سکتے ہیں۔

مگر حقیقت یہ ہے کہ مسلمان کی یہ تصویر اس کے لئے ازالۂ حیثیت عرفی کے ہم معنی ہے۔ مسلمان دنیا میں خدا کے دین کے نمائندہ ہیں۔ ان کے اور دوسری قوموں کے درمیان داعی اور مدعو کا رشتہ ہے۔ اس رشتہ کو اگر قومیت اور رقابت کا رشتہ بنا دیا جائے تو یہ دوسری قوموں کے لئے سب سے بڑا المیہ ہوگا اور مسلمانوں کے لئے سب سے بڑا جرم۔

دعوتی تدبیر

ومن احسن قولا ممن دعا الی اللہ وعمل صالحا وقال اننی من المسلمین۔ ولا تستوی الحسنۃ ولا السیئۃ ادفع بالتی هی احسن فاذا الذی بینك و بینہ عداوۃ کانہ ولی حمیم۔ وما یلقاھا الا الذین صبروا وما یلقاھا الا ذو حظ عظیم۔ واما ینزغنك من الشیطان نزغ فاستعذ باللہ انہ ھو السمیع العلیم

(۴۱ : ۳۳ - ۳۶)

اور اس سے بہتر کس کی بات ہوگی جس نے اللہ کی طرف بلایا اور نیک عمل کیا اور کہا کہ میں فرمانبرداروں میں سے ہوں۔ اور بھلائی اور برائی دونوں برابر نہیں۔ تم جواب میں وہ کہو جو اس سے بہتر ہو پھر تم دیکھو گے کہ تم میں اور جس میں دشمنی تھی وہ ایسا ہو گیا جیسے کوئی دوست قرابت والا۔ اور یہ بات اسی کو ملتی ہے جو صبر کرنے والے ہیں اور یہ بات اسی کو ملتی ہے جو بڑا نصیبہ والا ہے۔ اور اگر شیطان تمہارے دل میں کچھ وسوسہ ڈالے تو اللہ کی پناہ مانگو۔ بیشک وہ سننے والا، جاننے والا ہے

عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ نے اس آیت میں الحسنۃ سے قول توحید مراد لیا ہے۔ انھوں نے کہا : الحسنۃ لا الہ الا اللہ والسیئۃ الشرك (الجامع لاحکام القرآن للقرطبی ۱۵/۳۶۱)

اس تفسیر کی روشنی میں آیت کی تشریح کی جائے تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ سب سے بہتر تحریک وہ ہے جو دعوت الی اللہ کی بنیاد پر اٹھے۔ اگر کوئی شخص اپنے باطل مفروضات کی بنا پر تم سے دشمنی کرنے لگے تو اس کو تم اپنا دشمن نہ سمجھ لو۔ تمہارے اور اس کے درمیان پھر بھی ایک قرابت ہے، اور وہ یکساں فطرت کی قرابت ہے۔ اس کی باطل روش کو نظر انداز کرتے ہوئے تم اس کے سامنے اپنی دعوت حق پیش کرتے رہو۔ اس کے بعد عین ممکن ہے کہ اس کا ظاہری پردہ ہٹ جائے اور وہ تمہارے عقیدہ کو اپنا کر تمہارا قریبی دوست بن جائے۔

مگر یاد رکھو، دشمن کو دوست بنانے کی اس تدبیر کو زیر عمل لانے کی ایک لازمی شرط ہے، اور وہ صبر ہے۔ فریق ثانی کی اشتعال انگیزی سے تمہارے اندر مخالفانہ جذبات پیدا ہوں تو اس کو شیطان کی کارفرمائی سمجھو اور قول احسن کے رویہ پر ہر حال میں قائم رہو۔ یہ بلاشبہ اعلیٰ حوصلہ کی بات ہے مگر اس دنیا میں بڑا حوصلہ رکھنے والے لوگ ہی بڑی کامیابی حاصل کرتے ہیں۔

ایک اقتباس

سعودی عرب کے مشہور اخبار المسلمون میں ایک بڑے سعودی عالم کے حوالہ سے ایک سوال وجواب چھپا ہے۔ یہ سوال وجواب اور اس کا ترجمہ حسب ذیل ہے :

اهل السنة يشترطون للخروج على الحاكم قدرة التغيير دون إحداث ضرر، ولكن هناك فريقا في هذه الايام يرى ان هذا المنهج متخاذل ولا يصلح لهذا العصر ما رايك؟

-هذا من كلام الشيطان.. الذين يقولون ان التغيير لاتشترط معه القدرة فهم ليسوا متخاذلين فحسب، بل لقد املاهم الشيطان اقوالا ويريدون ان يؤمن بها الناس، وعموما لا يوجد شيء اسمه ثورة اسلامية الا اذا كان هناك ما يسمى "كباريه شرعي". الاسلام نصيحة وليس انقلابا. (المسلمون (جدة) - ٢٨ ابريل ١٩٩٥م)

ترجمہ

س : حاکم وقت کے خلاف خروج کے سلسلہ میں اہل سنت یہ شرط لگاتے ہیں کہ اس کے لیے کوئی نقصان برپا کیے بغیر تبدیلی لانے کی قدرت کا پایا جانا ضروری ہے۔ لیکن آج کل ایک فریق کا خیال ہے کہ یہ بے ہمتی کا طریقہ ہے اور موجودہ زمانہ کے لائق نہیں۔ اس بارے میں آپ کی رائے کیا ہے۔

ج : یہ ایک شیطانی بات ہے۔ جو لوگ یہ کہتے ہیں کہ تبدیلی کے لیے اس کی قدرت کی شرط نہیں ہے وہ خود نہ صرف بے ہمت ہیں، بلکہ شیطان نے ان کے ذہنوں میں کچھ باتیں ڈال دی ہیں اور وہ چاہتے ہیں کہ لوگ بھی ان پر ایمان لے آئیں۔ دنیا میں ایسی کسی چیز کا مطلق وجود نہیں جس کا نام اسلامی انقلاب ہو الّا یہ کہ یہاں کوئی ایسی چیز پائی جائے جو "شرعی کیبرے" کے نام سے موسوم ہو۔ اسلام نصیحت ہے نہ کہ کوئی انقلاب۔

"اسلام نصیحت ہے نہ کہ انقلاب" کا مطلب یہ نہیں ہے کہ اسلام انقلاب نہیں ہے، وہ صرف نصیحت ہی نصیحت ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اسلامی عمل کا آغاز نصیحت وتلقین سے ہوتا ہے نہ کہ انقلابی اکھیڑ پچھاڑ سے۔ نصیحت کے ذریعہ پہلے افراد کے ذہن کو بدلا جاتا ہے۔ ان کے اندر آمادگی پیدا کی جاتی ہے۔ جب یہ کام بڑے پیمانہ پر ہو چکا ہو، اس کے بعد فطری طور پر وہ وقت آجاتا ہے کہ وہ اجتماعی نتیجہ رونما ہو جس کو انقلاب کہا جاتا ہے۔